تدبرِ قرآن

۴۶

الأحقاف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ اس گروپ کی آخری مکّی سورہ ہے۔ اس کے بعد تین سورتیں مدنی ہیں جن میں انہی وعدوں اور وعیدوں کی تکمیل ہے جن کا پچھلی مکّی سورتوں میں ذکر ہوا ہے۔ اس کا قرآنی نام وہی ہے جو پچھلی سورہ کا ہے اور اس کی تمہید بھی بعینہٖ وہی ہے جو پچھلی سورہ کی ہے۔ اس میں مخالفین قرآن کو نہایت آشکارا الفاظ میں آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن جس روزِ قیامت سے تم کو خبردار کر رہا ہے وہ ایک امر شدنی ہے۔ شرک و شفاعت کے بل پر اگر تم اس انذار کو نظر انداز اور پیغمبرؐ کو ایک مفتری قرار دے رہے ہو تو یاد رکھو کہ تمھارے ان اوہام کے حق میں عقل و نقل کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ برعکس اس کے یہ قرآن ایک ایسی چیز ہے جس کی شہادت اس کے نزول سے پہلے ہی بنی اسرائیل کے ایک عظیم شاہد نے بھی دی ہے اور اس کی پیشین گوئیاں تورات میں بھی موجود ہیں جن کا یہ ٹھیک ٹھیک مصداق ہے اس وجہ سے تمھیں یہود و نصاریٰ کی شہ سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے، یہ لوگ تو خود اپنے رسولوں اور اپنے صحیفوں کو جھٹلا رہے ہیں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت واضح الفاظ میں تسلّی دی ہے کہ ان مخالفین کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمھاری ذمہ داری لوگوں تک اس کتاب کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کی طبیعت میں سلامت روی، حق شناسی اور عاقبت بینی ہے۔ ان لوگوں سے کسی خیر کی امید نہ رکھو جو بالکل مادر پدر آزاد ہیں۔ تم جو چیز پیش کر رہے ہو اس کی اثر آفرینی کا حال تو یہ ہے کہ راہ چلتے جنوں کے کان میں بھی اس کے کلمات پڑ گئے ہیں تو وہ بھی اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ اگر ان لوگوں پر اس کا اثر نہیں پڑ رہا ہے تو یہ اس کلام کی کوئی خرابی نہیں بلکہ ان کے دلوں ہی کی خرابی ہے۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کرو اور ان کو ان کے انجام کے حوالہ کرو جس کے ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) قرآن خدائے عزیز و حکیم کا نازل کیا ہوا صحیفہ ہے لیکن جو لوگ آخرت کے منکر ہیں وہ اس سے اعراض کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم غایت و مقصد کے

ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ایک دن اس کی مدت پوری ہو اور اس کا انجام ظاہر ہو۔ ان لوگوں کا اعتماد اپنے شرکاء و شفعاء پر ہے۔ ان کا گمان ہے کہ قیامت ہوئی تو وہ ان کو بچا لیں گے حالانکہ ان شرکاء کے حق میں نہ کوئی نقلی دلیل موجود ہے نہ عقلی۔ یہ لوگ ان سے لو لگائے بیٹھے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں کہ کوئی ان کی پرستش کر رہا ہے اور ان کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ وہ قیامت کے دن ان کے مددگار ہونے کے بجائے اُلٹے ان کے دشمن ہوں گے۔ یہ قرآن کے دلائل سے مرعوب ہو کر اس کو سحر کہتے اور پیغمبرؐ کو مفتری قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہٹ دھرم منہ لگانے کے قابل نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میں دنیا میں پہلا رسول نہیں ہوں، مجھ سے پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔ میں بھی انہی خصوصیات و صفات کے ساتھ آیا ہوں جن خصوصیات و صفات کے ساتھ وہ آئے۔ ان کو آگاہ کر دو کہ یہود و نصاریٰ کے چکمے میں آکر اگر تم میری مخالفت کر رہے ہو تو اس کے انجام بد کو اچھی طرح سوچ لو۔ بنی اسرائیل کا ایک عظیم شاہد میری گواہی دے چکا اور مجھ پر ایمان لا چکا ہے اور تورات کی پیشین گوئیوں کا بھی میں مصداق ہوں۔ اگر میرے اوپر غریب لوگ ایمان لائے ہیں تو اس کو بہانہ بنا کر اپنے کو اللہ کی رحمت سے محروم نہ کرو۔

(۱۵ — ۲۰) اس امر کا بیان کہ کس طرح کے لوگ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور کس طرح کے لوگ اس کی تکذیب کریں گے۔

اس پر ایمان وہ لائیں گے جو ان حقوق کو پہچانتے ہیں جن کا شعور فطرت کے اندر ودیعت ہے۔ جو اپنے ماں باپ کے احسان شناس اور ان کے فرمانبردار رہے ہیں۔ جوانی کے دور میں، اگرچہ جذبات کے غلبہ سے انھوں نے ٹھوکریں بھی کھائیں، لیکن اس طرح نہیں کہ گرے ہوں تو پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیا ہو بلکہ گرنے کے بعد سنبھلتے بھی رہے ہیں یہاں تک کہ جب وہ پختگی کے سن و سال یعنی چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو انھوں نے صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا کہ اے رب، اب تو ہمیں سنبھال کہ ہم تیرے ان انعامات کا شکر ادا کر سکیں جو تو نے ہم پر اور ہمارے ماں باپ پر کیے ہمیں عمل صالح کی توفیق بخش اور ہماری اولاد کو بھی صالح بنا۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا اور تیرے فرماں برداروں میں سے بنتے ہیں۔ اس طرح کے سلیم الفطرت لوگوں کے گناہوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا اور ان کو اہل جنت میں شامل کرے گا۔

اس کو جھٹلانے والے وہ ہوں گے جنھوں نے اس کے بالکل برعکس مادر پدر آزاد زندگی گزاری۔ نہ ماں باپ کے حقوق انھوں نے پہچانے اور نہ خدا کے حقوق کا کبھی ان کو خیال آیا۔ اگر ماں باپ نے آخرت اور حساب کتاب سے ڈرایا تو انھوں نے جھڑک دیا کہ یہ سب اگلوں کے ڈھکوسلے ہیں، ہم اس طرح کی خرافات پر ایمان لانے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر مرنے کے بعد پھر زندگی ہے تو آخر بے شمار خلقت جو مر چکی ہے وہ زندہ ہو کر کیوں نہیں واپس آتی۔

مذکورہ دونوں قسم کے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں ان کے اعمال کے اعتبار سے جزا یا سزا ہوگی۔ نیک اپنی نیکیوں کا بھرپور صلہ پائیں گے اور بد اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔

وہ متکبرین جو قرآن کے خلاف اس بات کو دلیل بنائے ہوئے ہیں کہ اس کو غریبوں نے قبول کیا ہے وہ جب دوزخ میں جھونکے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنے حصہ کی اچھی چیزیں دنیا میں لے چکے۔ اب یہاں تمھارے لیے ذلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(۲۱-۲۸) قریش کی تنبیہ کے لیے قومِ عاد کی مثال کہ ان کو بھی تمھاری ہی طرح اللہ کی پکڑ سے ڈرایا گیا لیکن انھوں نے اپنی قوت وصولت کے غرور میں اس کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا درآنحالیکہ وہ قوت وشوکت، اور تعمیر وتمدن کے اعتبار سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے لیکن ان کی ساری ذہانت و فطانت اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام نہ آئی۔

(۲۹-۳۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے قرآن سے متعلق جنوں کے ایک تاثر کا حوالہ کہ اگر قریش کے ناقدرے قرآن کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس میں قرآن کا یا تمھارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ انہی کے دلوں کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کی تاثیر و تسخیر کا حال تو یہ ہے کہ جنوں کی ایک جماعت کے کان میں اس کی چند آیتیں پڑ گئیں تو وہ اس پر اس طرح فریفتہ ہو گئے کہ اپنی قوم کے اندر وہ اس کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۳۳-۳۵) خاتمۂ سورہ۔ کفار کے لیے تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین۔

سُورَةُ الۡاَحۡقَافِ (٤٦)

مَكِّيَّةٌ —— آيات، ٣٥

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

آيات ١ - ١٤

حٰمٓ ﴿١﴾ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿٢﴾ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿٣﴾ قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَهُمۡ شِرۡكٌ فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيۡتُوۡنِىۡ بِكِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ هٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَةٍ مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿٤﴾ وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ يَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَنۡ لَّا يَسۡتَجِيۡبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ وَهُمۡ عَنۡ دُعَآئِهِمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿٥﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوۡا لَهُمۡ اَعۡدَآءً وَّكَانُوۡا بِعِبَادَتِهِمۡ كٰفِرِيۡنَ ﴿٦﴾ وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ۙ هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿٧﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ فَلَا تَمۡلِكُوۡنَ لِىۡ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِيۡضُوۡنَ فِيۡهِ ؕ

كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۸ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۹ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝۱۱ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۲ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۳ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴

ع ۱

ترجمۂ آیات ۱-۱۴

یہ حٰمٓ ہے۔ یہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے اتاری گئی ہے ۱-۲

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر ایک غایت اور معین مدت کے لیے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اس چیز سے اعراض کیے ہوئے ہیں جس سے ان کو آگاہ کیا گیا ہے۔ ۳

ان سے کہو کہ کبھی تم نے غور بھی کیا ان چیزوں پر جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو؟ مجھے دکھاؤ کہ زمین کی چیزوں میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے یا ان کا آسمانوں میں کون سا ساجھا ہے! میرے سامنے اس سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کرو یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ان کی دہائی دیتے ہیں جو تا قیامت ان کو جواب دینے والے نہیں ہیں اور وہ ان کی دعاؤں سے بے خبر بھی ہیں! اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔ ۴-۶

اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کافر لوگ حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس آگیا، کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو تم لوگ مجھے خدا سے ذرا بھی نہ بچا سکو گے اور تم جو سخن سازیاں کر رہے ہو وہ ان سے خوب واقف ہے، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے اور وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ ۷-۸

ان سے کہو کہ میں کوئی پہلا رسول تو نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا کہ تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ میں تو صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔ ۹

ان سے پوچھو کہ اس وقت کیا ہوگا اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد نے اس کے مانند کتاب کی گواہی بھی دی ہے سو وہ تو اس پر ایمان لایا اور تم نے تکبّر کیا! بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا! ۱۰

اور کفر کرنے والوں نے ایمان لانے والوں کے باب میں کہا کہ اگر قرآن کوئی خیر ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم پر سبقت نہ پاتے اور چونکہ انھوں نے اس سے ہدایت نہیں حاصل کی تو اب کہیں گے کہ یہ تو پُرانا جھوٹ ہے۔ ۱۱

اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب موجود ہے، رہنما اور رحمت! اور یہ کتاب اس کی پیشین گوئیوں کی مصداق ہے، عربی زبان میں تاکہ ان لوگوں کو آگاہ کرے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور یہ بشارت ہے خوب کاروں کے لیے۔ ۱۲

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہی لوگ اہل جنت ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے۔ یہ صلہ ہوگا ان کاموں کا جو وہ کرتے رہے۔ ۱۳-۱۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۝ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ (۱-۲)

یہ دونوں آیتیں پچھلی سورہ کی تمہید میں بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ بعینہٖ اسی نام اور اسی تمہید سے اس سورہ کا آغاز نہایت واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ دونوں میں نہایت واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ چنانچہ آگے کے مباحث سے ان کے اشتراک کا پہلو بھی سامنے آجائے گا اور جملہ حوامیم کا، جو پیچھے گزر چکی ہیں، خلاصہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ط وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ (۳)

یہ ان لوگوں کے حال پر اظہارِ افسوس ہے جو خدائے عزیز و حکیم کے اتارے ہوئے اس صحیفۂ گرامی کی تکذیب پر مُصر اور اس چیز سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے تھے جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ نے اس کو نازل کیا تھا۔

اس دنیا کے بامقصد ہونے کا تقاضا ہے کہ اس کے بعد روزِ جزا ہو

'عَمَّآ اُنْذِرُوْا' سے اشارہ ظاہر ہے کہ قیامت کی طرف ہے اور قیامت، ایک ایسی حقیقت ہے جس کو نہ ماننے سے یہ سارا کارخانۂ عالم ایک بالکل عبث اور بے مقصد و بے غایت کھیل بن کے رہ جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ عالم 'بِالْحَقِّ' یعنی ایک غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ 'عزیز' یعنی غالب و مقتدر ہونے کے ساتھ 'حکیم' بھی ہے۔ اگر قیامت نہ ہو تو اس دنیا کو دیکھ کر یہ بات تو ثابت ہو گی کہ اس کے بنانے والے کی قدرت بے نہایت ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ اس نے یہ ایک بالکل بے مقصد اور باطل کام کر ڈالا ہے۔ حالانکہ یہ بات اس کی ظاہر صفات کے بالکل منافی ہے۔ اس دنیا سے جس طرح اس کی قدرت ظاہر ہوتی ہے اسی طرح اس کی حکمت بھی مشاہدے میں آتی ہے اور یہ دونوں صفتیں بالکل پہلو بہ پہلو اس میں موجود ہیں۔ یہاں زبان کا وہ نکتہ یاد رکھیے جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ جب صفات کا بیان بغیر حرفِ عطف کے ہو جس طرح 'العزیز الحکیم' میں ہے تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ صفات موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

'بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی' یعنی جس طرح اس کائنات کا 'بِالْحَقِّ' ہونا واضح ہے اسی طرح اس کے 'بالحق' ہونے کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ دنیا اسی طرح برابر چلتی نہ رہے بلکہ ضروری ہے کہ یہ ایک معین مدت تک کے لیے ہو جس کے بعد یہ ختم ہو۔ پھر اس کی عدالت قائم ہو۔ جس نے اس میں نیکی کمائی ہو اس کو اس کی نیکی کا صلہ ملے اور جس نے بدی کمائی ہو وہ اپنی بدی کی سزا بھگتے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہ بات تو معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کی جزا یا سزا پائے لیکن اس کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ یہ پوری دنیا ایک معین مدت کے بعد ختم ہو جائے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ برابر قائم بھی رہے اور جو مرتے جائیں ان کی عدالت بھی ہوتی رہے؟ یہ سوال یوں تو ذہن میں متعدد غلط فہمیوں کے موجود ہونے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے جن پر یہاں بحث کے لیے گنجائش نہیں ہے لیکن ایک چیز کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے، وہ یہ کہ انسان کا ہر عمل خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا، اپنے اندر متعدّی ہونے کی خصوصیات رکھتا ہے۔ ایک شخص ایک نیکی کا تخم بوتا ہے جس کی برکتوں سے صدیوں اور قرنوں تک اولادِ آدم مستفید ہوتی ہے، اسی طرح ایک شخص ایک غلط اور گمراہ کن فلسفہ ایجاد کرتا ہے جس کی ضلالت ایک

خلقِ کثیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور پھر وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اتنی مستحکم ہوتی جاتی ہے کہ اس کو اکھاڑنا تو درکنار، قوموں کے بعد قومیں اٹھتی اور اپنی صلاحیتیں ان کو پروان چڑھانے پر صرف کرتی ہیں۔ اس صورتِ حال کے سبب سے کسی کی نیکی یا بدی کا صحیح اندازہ اس کو کرانا ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ ان کے بعید سے بعید اثرات اس کے سامنے لائے جائیں اور عناصرِ کائنات میں سے جو بھی اس کی کسی نیکی یا بدی کے گواہ ہوں ان کو پیش کیا جائے۔ اس کے بغیر کامل عدل ظہور میں نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ ایک دن اس دنیا کی مدت پوری ہو اور اللہ تعالیٰ ایک ایسی عدالت میں لوگوں کا فیصلہ فرمائے جس میں سب حاضر ہوں۔ یہاں تک کہ آسمان اور زمین سے بھی اگر کسی معاملہ میں گواہی مطلوب ہو تو ان کو بھی ان کے سارے ریکارڈ کے ساتھ طلب کیا جائے۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سب کا روزِ انصاف ایک ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۖ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴)

شرک کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے

یہ ان لوگوں کے اعراض کے اصل سبب پر ضرب لگائی ہے کہ ان کا اعتماد چونکہ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر ہے اس وجہ سے یہ قرآن کے انذار کی کوئی پروا نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اوّل تو قیامت محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور اگر اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو ہم جن معبودوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ ہم کو ہر خطرے سے بچا لیں گے۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو کہ تم اللہ کے سوا جن چیزوں کو پکارتے ہو کبھی ان پر غور بھی کیا ہے کہ ان کی کچھ حقیقت بھی ہے یا یہ محض تمہارے ذہن ہی کی ایجاد ہیں! اگر تم ان کی کچھ حقیقت سمجھتے ہو تو ذرا مجھے بھی دکھاؤ کہ انھوں نے زمین یا اس کی چیزوں میں سے کیا چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کیا حصہ ہے! مطلب یہ ہے کہ خدا کے شریک بننے کے حق دار تو صرف اسی شکل میں وہ ہو سکتے ہیں جب آسمان و زمین کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہو۔ اگر اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے تو آخر ان کو اس خدا کے حقوق میں شریک کرنے کے کیا معنی جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خالق ہے۔ وہ خالق ہو کر کس طرح گوارا کرے گا کہ اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کے مالک دوسرے بن بیٹھیں! اور تم نے یہ کس طرح جائز سمجھا کہ اس کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس کی حکومت اور اس کے حقوق میں شریک بنا دو! یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکینِ عرب ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ اس وجہ سے اس دلیل کی بنیاد ایک ایسی حقیقت پر ہے جو ان کے نزدیک بھی مسلّم تھی۔

اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ اَثَارَةٌ اس

روایت کو کہتے ہیں جو سلف سے منقول ہوتی چلی آرہی ہو۔ الاثارۃ البقیۃ من العلم تو ثر وھم علی اثارۃ من العلم ای بقیۃ منہ یاثرونھا من الاولین (اقرب الموارد) اس کے ساتھ مِّنْ عِلْمٍ کی قید اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اس روایت کی بنیاد محض وہم وگمان پر نہیں بلکہ علم پر ہو۔

خدا کی گواہی کے معلوم کرنے کا قابلِ اعتماد ذریعہ

یعنی اگر تم مدعی ہو کر خدا نے تمھارے معبودوں کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے تو اپنے اس دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لیے یا تو اس قرآن سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کرو یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد وہم وگمان پر نہیں بلکہ علم پر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں؛ اس باب میں اصلی گواہی خود خدا ہی کی ہوسکتی ہے کہ اس نے اپنا شریک کسی کو بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو کس کو؟ خدا کی گواہی کو جاننے کا واحد ذریعہ اس کی نازل کردہ کتابیں ہیں یا وہ روایات و آثار جو اس کے نبیوں اور رسولوں سے صحیح طور پر سلف سے خلف کو منتقل ہوئے۔ فرمایا کہ اس طرح کی کوئی چیز ہو تو اس کو پیش کرو محض وہم کی بنیاد پر ایک ہوائی قلعہ تعمیر کرکے اپنی عاقبت نہ خراب کرو۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ علم یا تو اس کی کتابوں کے ذریعہ سے خلق کو منتقل ہوا ہے مثلاً تورات وانجیل وغیرہ کے ذریعہ سے یا روایات و آثار کے ذریعہ سے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی تعلیمات بعد والوں کو روایات ہی کے ذریعہ سے پہنچیں۔ ان ذرائع سے جو علم منتقل ہوا اس میں کہیں شرک کے حق میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ تورات، انجیل اور دوسرے صحیفوں میں اگرچہ بہت سی تحریفات ہوچکی ہیں تاہم ان کے اندر شرک کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق جو روایات تورات، انجیل یا دوسرے صحیفوں میں نقل ہوئی ہیں ان میں بھی شرک کا کوئی جزو مذہب نہیں ہے۔ مشرکین عرب اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ہونے کے مدعی ضرور تھے لیکن قرآن کے بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ یہ ثابت کرنے سے قاصر رہے کہ ان کے باپ دادا کے طریقہ کی بنیاد کسی شرعی یا عقلی دلیل پر تھی۔ آخر تک وہ یہی کہتے رہے کہ جس طریقے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اسی پر ہم چلتے رہیں گے، اس سے بحث نہیں کہ انھوں نے یہ طریقہ کہاں سے لیا۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ (۵-۶)

مشرکین کے معبودوں کی بے حقیقتی اور بے خبری

یہ ان نادانوں کے حال پر اظہارِ افسوس ہے کہ ان لوگوں سے بڑھ کر گمراہ اور محروم القسمت کون ہوسکتا ہے جو اللہ کے سوا ان سے دعا و فریاد کر رہے ہیں جو قیامت تک ان کو کوئی جواب دینے والے نہیں ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ کوئی ان سے دعا و فریاد کر رہا ہے! قیامت

کے دن ان کی طرف سے کوئی مدد ملنا تو درکنار وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔

مشرکین جن کی پرستش کرتے تھے وہ یا تو فرضی ہستیاں تھیں جن کا کوئی مسمّٰی سرے سے موجود ہی نہ تھا، اس وجہ سے ان کے کسی چیز سے باخبر ہونے یا کسی دعا کے قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی وہ ہستیاں جن کی کچھ حقیقت ہے مثلاً ملائکہ یا جنّات جن کی پرستش مشرکینِ عرب کرتے تھے یا حضرت مسیح علیہ السلام جن کی پرستش عیسائی کرتے تھے وہ تو بذاتِ خود کسی کی دعا و فریاد سے واقف بھی نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ اس کو قبول کر سکیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے قیامت کے دن سوال کرے گا کہ کیا تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو معبود بنا ؤ؟ وہ جواب دیں گے کہ میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا تھا جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا! میں نے ان کو وہی بتایا جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ میرے بعد انھوں نے کیا بنایا اس کی خبر مجھے نہیں ہے۔ اس کو تو ہی جانتا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرشتوں کا جواب ان الفاظ میں منقول ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ ءَأَنتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنبَغِي لَنَا أَن نَّتَّخِذَ مِن دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِن مَّتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ۝ (الفرقان: ۱۷-۱۸)	اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ ان کو اور ان سب کو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، اکٹھا کرے گا۔ پس پوچھے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا انھوں نے خود راہ کھوئی؟ وہ جواب دیں گے تو پاک ہے۔ ہمارے لیے یہ زیبا نہ تھا کہ ہم تیرے سوا دوسرے کو کارساز بناتے۔ بلکہ یوں ہوا کہ تو نے ان کو اور ان کے آباد و اجداد کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ وہ تیری یاد دہانی بھول بیٹھے اور ہلاک ہونے والے بنے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک انبیاء اور صالحین کا تعلق ہے وہ تو ساری ذمہ داری ان لوگوں پر ڈال دیں گے جنھوں نے ان کی تعلیم کے بالکل خلاف ان کو شریکِ خدا ٹھہرایا اور ان کی پرستش کی۔ رہے دوسرے معبود یعنی جنات و شیاطین وغیرہ تو وہ جس طرح اپنے پرستاروں سے اعلانِ براءت کریں گے اور ان کے پرستار جس طرح ان پر لعنت کریں گے اس کی تفصیلات مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت کے دن ان کا کچھ نافع ہونا تو درکنار سب سے زیادہ بدتر دشمن اپنے پرستاروں کے وہی ہوں گے۔ سورۂ قصص کی آیات ۶۲ - ۶۴ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۷)

قرآن سے فرار کے بہانے

اب یہ ان بہانوں کا ذکر ہو رہا ہے جو قرآن سے فرار کے لیے وہ ایجاد کرتے تھے۔ فرمایا کہ جب ہماری نہایت واضح آیتیں درباب توحید و قیامت ان کو سنائی جاتی ہیں اور ان سے ان کا کوئی جواب نہیں بن آتا تو وہ اس قرآن کے باب میں کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ قرآن کو جادو کہنے کی وجہ کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ قریش کے لیڈروں کے لیے جب اس کی تاثیر و تسخیر کا لوہا ماننے بغیر چارہ نہیں رہا تو انھوں نے اپنے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہے تو یہ کلام نہایت پُر زور اور پر تاثیر لیکن یہ زور و تاثیر اس کے خدائی کلام ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے۔

'لِلْحَقِّ' کے بعد 'لَمَّا جَآءَهُمْ' کے الفاظ ان کے اس فعل کی شناعت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اس حق کو انھوں نے جادو اس وقت قرار دیا جب کہ وہ ان کے پاس آ گیا۔ حق کے بارے میں کوئی مغالطہ اس وقت تک تو بعید نہیں ہے جب تک وہ سامنے نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے سامنے آجانے کے بعد وہی لوگ اس قسم کی باتیں بناتے ہیں جو خود بھی مغالطہ میں رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۸)

یہ قرآن کے مخالفین کے ایک اور پراپیگنڈے کا حوالہ ہے۔ چونکہ یہ نہایت ہی لغو پروپیگنڈہ تھا جس کا لغو ہونا خود ان لوگوں پر بھی واضح تھا جو اس کے مرتکب ہو رہے تھے اس وجہ سے اس کا ذکر نہایت استعجاب و حیرت کے انداز میں فرمایا ہے کہ اس کا کوئی جواب دینے کے بجائے معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا ہے کہ اگر تم لوگ میری مخالفت کے جنون میں اس حد تک اتر آئے ہو کہ اپنے ضمیر کے بالکل خلاف مجھے ایک مفتری قرار دینے میں بھی کوئی باک نہیں رہا تو اب تم سے کوئی بحث بے سود ہے۔ اس معاملہ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔

'قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا' مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن ہے تو تمھاری اپنی تصنیف لیکن تم اس کو جھوٹ موٹ خدا کی وحی قرار دے رہے ہو تو ان سے کوئی بحث نہ کرو۔ بس یہ کہہ دو کہ اگر میں نے خدا پر اتنا بڑا افترا کیا ہے تو کوئی چیز مجھے اس کی پکڑ سے نہ بچا سکے گی اور اس وقت تم لوگ میرے کچھ کام آنے والے نہیں ہو گے کہ تم میرے اس جرم کا بار اپنے اوپر

محسوس کرو۔

'ھُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِيۡضُوۡنَ فِيۡهِ ۔ اَفَاضَ فِي الحديث' کے معنی کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کا اصل مفہوم کسی بات میں نکتہ چینی کرتے کرتے اس کو اس حد تک بڑھا دینا ہے کہ رائی پربت بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جو سخن سازیاں کر رہے ہو اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح آگاہ ہے اس وجہ سے میں معاملہ اسی کے حوالہ کرتا ہوں۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ فی الواقع میں کوئی مفتری ہوں اس وجہ سے تم مجھے کوئی وزن نہیں دے رہے ہو یا مجھے ایک راستباز اور امین جانتے ہوئے محض اس وجہ سے مفتری قرار دے رہے ہو کہ میری دعوت تمھارے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہے۔

ہٹ دھرموں کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیا جائے

'وَكَفٰى بِهٖ شَهِيۡدًا ۢ بَيۡنِيۡ وَبَيۡنَكُمۡ' اس قضیہ میں اللہ تعالیٰ میرے اور تمھارے مابین گواہی کے لیے کافی ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جب معلوم ہو کہ فریق مخالف ضد اور دھاندلی پر اتر آیا ہے اور جان بوجھ کر وہ ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو خود اس کے اپنے ضمیر کے بھی خلاف ہے تو ایسی صورت میں واحد چارۂ کار ایک معقول انسان کے لیے یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ معاملہ اللہ کے حوالہ کر کے بحث ختم کر دے۔ یہ شریفانہ طریقہ بعض اوقات ضدی مخاطبوں کو بھی اپنے رویہ پر نظر ثانی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ وہ اس سے متاثر نہ بھی ہوں جب بھی دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت طریقہ یہی ہے۔ بغیر جانبدار ذہن کے لوگ اس سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور مخالفوں کے دل میں بھی داعی کی عظمت اس کی اس خود اعتمادی کے سبب سے دوچند ہو جاتی ہے۔

'وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ' یعنی میں یہ معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ اس کا فیصلہ ضرور فرمائے گا اور یہ حقیقت سب پر واضح ہو جائے گی کہ میں مفتری ہوں یا تم لوگ جان بوجھ کر حق کو جھٹلانے والے ہو۔ اگر اس فیصلہ میں کچھ دیر بھی ہوئی جب بھی میرے لیے مایوسی اور پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ لوگوں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ آخری حد تک مہلت دیتا ہے تاکہ جو توبہ و اصلاح کرنا چاہیں وہ توبہ و اصلاح کر کے اس کی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔

قُلۡ مَا كُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَاۤ اَدۡرِىۡ مَا يُفۡعَلُ بِىۡ وَلَا بِكُمۡ ؕ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰۤى اِلَىَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ (۹)

یعنی اگر تم میری مخالفت اس وجہ سے کر رہے ہو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں اور وہ عذاب دکھا نہیں سکتا جس سے تم کو ڈرا رہا ہوں تو یاد رکھو کہ میں دنیا میں پہلا شخص نہیں ہوں جو رسول بن کر آیا ہو۔ مجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول آ چکے ہیں۔ وہ سب بشر ہی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مافوق بشر نہیں۔ رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی یہی رہی ہے کہ انسانوں کے اندر رسول ہمیشہ انسانوں ہی کے

اندر سے آئے ہیں اور یہ بات بھی سن لو کہ اگر میں تمہاری طلب کے مطابق عذاب نہیں لا سکتا تو یہ چیز بھی میرے دعوائے رسالت کی نفی نہیں کرتی۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدا یا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ مجھے خود برملا یہ اعتراف ہے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور نہ یہ علم ہے کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کر رہا ہوں جو مجھے وحی کی جاتی ہے اور اسی سے تم کو بھی آگاہ کر رہا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ میرے اوپر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ میں اس سے زیادہ کچھ اور ہونے کا مدعی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے اگر کوئی بحث کرنی ہے تو میرے اصل دعوے سے متعلق کرو، غیر متعلق سوالات چھیڑ کر نہ اپنے آپ کو الجھن میں ڈالو، نہ دوسروں کو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰)

یہاں جوابِ شرط محذوف ہے اور یہ حذف اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جوابِ شرط ایسے خوفناک نتائج پر متضمن ہے کہ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کتاب کا انکار اور اس کو خدا کے اوپر میرا افترا قرار دے رہے ہو لیکن اگر یہ خدا کی طرف سے ہوئی تب کیا بنے گا!! ساتھ ہی یہ بات بھی تمہارے سوچ لینے کی ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد اس طرح کی چیز کی گواہی دے چکا ہے، وہ تو اس پر ایمان لایا اور تم استکبار کی بنا پر اس سے اعراض کیے جا رہے ہو!

شاہد سے کون مراد ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہد سے کس کی طرف اشارہ ہے۔ اس سوال کے تین جواب ہمارے مفسرین نے دیے ہیں۔

عام رائے تو یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہیں لیکن ایک دوسرے گروہ نے اس پر یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ اس سورہ کے نزول کے بہت بعد مدینہ میں اسلام لائے تو اس مکی سورہ میں ان کے اسلام سے پہلے ہی ان کی گواہی کے حوالہ دینے کے کیا معنی، جب کہ کوئی ادنیٰ قرینہ بھی یہاں اس بات کا نہیں ہے کہ کم از کم اس آیت ہی کو مدنی قرار دیا جا سکے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے لیکن یہ قول بھی کچھ وزنی نہیں ہے۔ آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کا ذکر قرآن کے حق میں ان کی شہادت ہی کا حوالہ دینے کے لیے مستقلاً، نام کی تصریح کے ساتھ، آ رہا ہے تو یہاں اشارے کی صورت میں ان

کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک تیسرے گروہ نے اس کو اسم جنس کے مفہوم میں لے کر اس سے ان عام لوگوں کی شہادت مراد لی ہے جو بنی اسرائیل میں سے قرآن پر ایمان لائے۔ اس گروہ میں ابن کثیرؒ بھی شامل ہیں لیکن یہ قول بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ اس کو اسم جنس کے مفہوم میں لینا قواعد زبان کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن ہم اس غیر ضروری بحث میں یہاں پڑنا نہیں چاہتے۔ اسلوب کلام یہاں خود شاہد ہے کہ نکرہ تفخیم شان کے لیے ہے نہ کہ تحقیر و تعمیم کے لیے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ اشارہ کسی ایسے شاہد کی طرف ہو جس کی شخصیت اور شہادت دونوں کا مرتبہ ایسا ہو کہ اس کو بطور ایک دلیل کے پیش کیا جا سکے۔

ہمارے نزدیک یہ اشارہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی طرف ہے۔ اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی بعثت کا خاص مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ میں آنے والے کی راہ صاف کرنے آیا ہوں۔ آپ کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ آخری نبی بھی ہیں اور آخری رسول بھی۔ اس وجہ سے اس آنے والے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو مراد لینے کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔ انجیلوں کا مطالعہ کیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ کو حضرت مسیح کی بشارت دینے کے لیے مبعوث فرمایا اسی طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا کہ وہ آنے والے کی راہ صاف کریں۔ انجیلوں میں اصل مضمون جو گوناگون اسلوبوں سے سامنے آتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہی ہے۔ استاذ امامؒ نے خاص اس موضوع پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ انجیلوں کا اصل مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جس آسمانی بادشاہت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کی جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں وہ تمام تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اگرچہ تورات اور زبور وغیرہ میں بھی ہے جن کے حوالے ہم پچھلی سورتوں میں نقل کر آئے ہیں لیکن حضرت مسیح علیہ السلام نے نام کی تصریح کے ساتھ آپ کی بشارت دی ہے۔ سورۂ صف میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	اور یاد کرو جب کہ عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل
يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ	میں اللہ کی جانب سے تمہاری طرف رسول ہو کر آیا ہوں،
اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ	مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو میرے پہلے سے
مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ	تورات میں موجود ہیں اور خوش خبری دیتا ہوا ایک
مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا	رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہوگا۔

جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصف: ۶) — پس جب وہ کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

قرآن نے اس آیت میں جس بشارت کا حوالہ دیا ہے وہ انجیلوں میں موجود ہے۔ بعض انجیلوں میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کی تصریح بھی بار بار وارد ہوئی ہے۔ مثلاً برنا باس کی انجیل میں — عیسائی اسی وجہ سے اس انجیل کو مستند نہیں مانتے لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا، دوسری انجیلوں میں بھی آپ کا حوالہ موجود ہے۔ اگرچہ نام غائب کر کے صرف صفات کا حوالہ باقی رہنے دیا گیا ہے اور ترجموں کے ذریعہ سے ان صفات کو بھی مسخ و محرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم جو شخص ایمان داری کے ساتھ ان پر غور کرے گا وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا ان کا مصداق نہیں ہوسکتا۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے۔ ان شاءاللہ سورۂ صف کی تفسیر میں اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث کریں گے۔

۳- تیسری چیز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیشین گوئیوں میں قرآن، قرآن کی دعوت، اس دعوت کے مزاج، دنیا پر اس دعوت کے غلبہ اور اس غلبہ کے مراحل و مدارج کا نہایت صاف الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم بعض چیزوں کا حوالہ دے چکے ہیں۔ آگے سورۂ فتح کی آیت ۲۹ کے تحت بھی ہم اس مسئلہ پر بحث کرنے والے ہیں۔ قارئین کے اطمینان کے لیے بعض حوالے یہاں بھی ہم نقل کرتے ہیں۔

"یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا۔ وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے؟ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی: باب ۲۱: ۴۱-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔" یوحنا: باب ۱۴: ۱۷

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" یوحنا: باب ۱۴: ۳۱

اسلامی دعوت کے تدریجی فروغ کی طرف بھی متعدد تمثیلوں میں اشارے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک تمثیل جس کی طرف سورۂ فتح میں قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے، یہ ہے۔

"اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کی مانند

ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آ کر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔" متی، باب ۱۳ : ۳۱ - ۳۲

۴۔ چوتھی اہم چیز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس واضح شہادت کا یہ اثر تھا کہ عیسائیوں میں سے جو لوگ اصل نصرانیت پر قائم رہے یعنی ان کے خلیفہ صادق شمعون کے پیرو، وہ قرآن کے نزول کے بعد بڑے جوش و خروش سے اس پر ایمان لائے اور قرآن نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے۔ سورۂ مائدہ میں اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (المائدۃ : ۸۲-۸۳)	تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور اہلِ ایمان کی محبت میں سب سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں علماء اور راہب ہیں اور وہ تکبر کرنے والے نہیں ہیں۔ یہ لوگ جب اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو حق کو پہچان لینے کے سبب سے تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب ہم ایمان لائے تو ہم کو تو حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ۔

تدبر قرآن میں ان آیات کی تفسیر غور سے پڑھ لیجیے۔ نصاریٰ کی تاریخ سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس وجہ سے ان آیات کا صحیح مفہوم ان پر واضح نہیں ہو سکا۔ یہ پال کے پیروؤں کی تعریف نہیں ہے بلکہ شمعون کے پیروؤں کی ہے۔ پال کے پیرو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے بھی نہیں۔ وہ اس لفظ کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس کی جگہ انھوں نے اپنے لیے مسیحی کا لفظ اختیار کیا ہے۔ شمعون کے پیرو بے شک اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے تھے۔ یہ لوگ اس شہادت کے حامل رہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے آخری رسول کی بعثت کے باب میں دی تھی اور جب وقت آیا تو انھوں نے پورے جوش و خروش اور نہایت سچے جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس کی شہادت دی۔ اسی چیز کی طرف رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس تکبر میں مبتلا نہیں ہوئے جس میں پال اور اس کے پیرو مبتلا ہوئے اس وجہ سے اسلام کی دولت سے بہرہ مند ہوئے۔ انہی لوگوں کے باب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ "مبارک ہیں وے جو دل کے غریب

ہیں، وہ آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے"۔ اوپر سورۂ مائدہ کی آیت میں 'وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ'
کے الفاظ سے ان کے اسی وصف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت کی نوعیت ایک عام شہادت سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی بعثت ہی خاص اس مقصد سے ہوئی تھی کہ وہ آپؐ کی راہ صاف کریں اور خلق کو اس آسمانی بادشاہی کی بشارت دیں جس کا آپؐ کے ذریعہ سے ظہور ہونے والا تھا۔ اس حوالہ سے قرآن نے مشرکین پر بھی حجت قائم کی ہے اور اہل کتاب پر بھی۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ دعوت کے اس دور میں قریش کو اہل کتاب کی پشت پناہی بھی حاصل ہو گئی تھی اس وجہ سے ان کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ قرآن نے یہاں یہی دکھایا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے جنون میں آج یہودی اور مسیحی جو حرکتیں چاہیں کریں لیکن بنی اسرائیل کا ایک عظیم شاہد اس حق کی نہایت آشکارا الفاظ میں شہادت دے چکا اور اس پر ایمان لا چکا ہے۔ اس کے ایمان اور اس کی شہادت کے بعد جو لوگ محض استکبار کی بنا پر اس حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہ اپنا انجام اچھی طرح سوچ لیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس کتاب میں بار بار ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کبھی راہ یاب نہیں کرتا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور اس کی بخشی ہوئی روشنی کی ناقدری کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس نے عقل کی رہنمائی اور آفاق و انفس کی گواہی کے ساتھ ساتھ اپنے نبیوں اور رسولوں کی شہادت کے ذریعہ سے بھی حق کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اب جو لوگ ان ساری چیزوں کو ہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اپنی ضلالت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں ایسے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لا کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو وہ بھٹکنے ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ (۱۱)

منکرین کے استکبار کی وضاحت

اوپر والی آیت میں ان منکرین کے جس استکبار کا حوالہ ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ ان ظالموں کی رعونت کا حال یہ ہے کہ اس حق کے خلاف ایک دلیل وہ یہ بھی لاتے ہیں کہ اس کو سب سے پہلے غریبوں نے قبول کیا ہے چنانچہ ان کے اغنیاء کہتے ہیں کہ اگر اس نئے دین میں کوئی خیر ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ فقیر لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت کر جاتے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی کوئی اور نعمت تو ان کے حصہ میں آئی نہیں تو یہ چیز اگر فی الواقع کوئی نعمت ہوتی تو یہ اس کی طرف سبقت کرنے والے نہ بنتے بلکہ ہم ہی اس کی طرف بھی سبقت کرتے۔ ان کا اس کی طرف سبقت کرنا دلیل ہے کہ اس میں کوئی

خیر نہیں ہے بلکہ یہ انھی چیزوں میں سے ہے جن کے درپے ادنیٰ درجہ کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔

'وَاِذْ لَمْ یَہْتَدُوْا بِہٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ ھٰذَآ اِفْکٌ قَدِیْمٌ' یعنی اب جبکہ اس روشنی سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے گمراہی اور خیرگی ہی حاصل کی ہے تو جو کچھ انھوں نے کہا ہے صرف اسی پر بس نہیں کریں گے بلکہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ کوئی نیا جھوٹ نہیں ہے بلکہ یہ جھوٹ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے، ہر دور میں کچھ لوگ رہے ہیں جو اسی قسم کے ڈراوے سنا کر لوگوں پر اپنی دھونس جماتے رہے ہیں لیکن ان کی بات آج تک سچی ثابت نہیں ہوئی۔ جس قیامت سے انھوں نے ڈرایا نہ وہ آئی نہ کبھی آئے گی۔ اس طرح کے لوگوں کا جھوٹ اب بالکل کھل چکا ہے اس وجہ سے ہم ان کی دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔

'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' سے قرینہ دلیل ہے کہ یہاں کفار کے اغنیاء مراد ہیں جن کے استکبار کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا ہے۔ 'لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے یہاں غربائے مسلمین مراد ہیں اور 'ل' یہاں 'فِی' کے مفہوم میں ہے یہ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

'وَاِذْ لَمْ یَہْتَدُوْا بِہٖ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جب انھوں نے ایک بالکل واضح حق کا انکار کیا ہے تو اپنے ضمیر کو تسلی دینے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے انھیں اور بھی باتیں بنانی پڑیں گی چنانچہ وہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹ تو بہت پرانا جھوٹ ہے۔ اس کو پرانا جھوٹ قرار دینے میں دلیل کا پہلو، ان کے زعم کے مطابق یہ ہے کہ اس کا جھوٹ ہونا بالکل ثابت ہو چکا ہے۔ اگر قیامت آنے والی ہے تو آخر وہ کہاں غائب ہے! ایک مدت دراز سے اس کا چرچا ہے لیکن جہاں تک اس کے ظہور کا تعلق ہے ہنوز روزِ اول ہے۔

وَمِنْ قَبْلِہٖ کِتٰبُ مُوْسٰٓی اِمَامًا وَّرَحْمَۃً ؕ وَھٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ (۱۲)

قرآن کے حق میں تورات کی شہادت کا حوالہ

یہ قرآن کے حق میں تورات کی شہادت کا حوالہ ہے۔ اگرچہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے اس کا ذکر مقدم ہونا تھا لیکن ان خاص وجوہ سے، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، حضرت مسیحؑ کی شہادت کا ذکر پہلے آیا۔ اب یہ تورات کا حوالہ دے کر اس شہادت کے تسلسل کو ظاہر فرما دیا کہ اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب بھی 'امام' اور 'رحمت' بن کر آ چکی ہے۔ 'امام' کے معنی رہنما کے ہیں۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو قرآن کے باب میں 'ھُدًی وَّرَحْمَۃً' کے الفاظ سے ارشاد ہوئی ہے اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ دنیا اور آخرت دونوں کو پیش نظر رکھ کر استعمال ہوئے ہیں۔ اللہ کی کتاب دنیا میں رہنمائی کرتی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کی اصل حیثیت امام کی ہے۔ جس طرح امام کی اقتدا لازمی ہے اسی طرح زندگی کے معاملات میں اس کتاب کی اقتدا واجب ہے۔ اگر

اس کی یہ حیثیت باقی نہ رہے تو خواہ زبان سے اس کا کتنا ہی احترام کیا جائے اور اس کو کتنا ہی چوما چاٹا جائے لیکن یہ ساری باتیں عنداللہ بے سود ہیں۔

قرآن تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے

'وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا' یہ قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوا ہے۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کے باب میں شہادت دی ہے اسی طرح اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس کی پیشین گوئی کر چکے ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں اپنے مصداق کی منتظر تھیں۔ قرآن کے نزول سے یہ مصداق سامنے آگیا اور اس طرح قرآن نے تورات کی تصدیق کر دی۔

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ قرآن چونکہ تورات کو ایک آسمانی کتاب تسلیم کرتا ہے اس وجہ سے قرآن بھی ایک آسمانی کتاب ہوا۔ یہ بات بالکل لایعنی ہے۔ قرآن اگر تورات کو ایک آسمانی کتاب مانتا ہے تو یہ تورات کے آسمانی ہونے کی ایک دلیل تو بے شک ہوتی لیکن اس سے قرآن کا آسمانی ہونا کیسے ثابت ہو جائے گا؟ قرآن کے آسمانی ہونے کی تصدیق تورات کی زبان سے تو اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے اندر قرآن اور اس کے حامل سے متعلق پیشین گوئیاں ہوں اور قرآن کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان پیشین گوئیوں کی اس طرح تصدیق ہو جائے کہ کسی منصف کے لیے اس سے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے بلکہ ہر دیانت دار اور غیر جانبدار آدمی پکار اٹھے کہ بے شک ان پیشین گوئیوں کا حقیقی مصداق سامنے آگیا اور اس مصداق نے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اسی پہلو سے پچھلے صحیفوں کا مصداق کہا ہے، نہ کہ اس پہلو سے جو لوگوں نے عام طور پر سمجھا ہے۔ قرآن ان صحیفوں کا آسمانی ہونا تو بے شک مانتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کے محرّف ہونے کا بھی اعلان کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ تصدیق مطلق نہیں بلکہ اس خاص مفہوم میں ہے جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے۔ اس مفہوم کے لیے لفظ تصدیق کا استعمال عربی میں معروف ہے۔ اس کے محل میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' یہ اہل عرب پر احسان کا اظہار بھی ہے اور اس میں تورات کی بعض پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اہل عرب پر احسان کا پہلو تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب عربی میں نازل فرما کر ان کی زبان کی عزت بڑھائی، اس کو بقائے دوام کی سند عطا فرمائی، ان کو اپنے دین کی ترجمانی اور اس کی گواہی کے لیے چنا اور ان کے ہر عذر کا خاتمہ کر دیا۔

سابق پیشین گوئیوں کی طرف اس میں اشارہ کا پہلو یہ ہے کہ تورات میں آخری رسول سے متعلق یہ بات موجود ہے کہ اس کی بعثت امیوں یعنی بنی اسماعیل میں ہوگی۔ ان امیوں کی زبان ظاہر

ہے کہ عربی تھی اس وجہ سے ان کی زبان کا حوالہ گویا خود ان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

'لِّیُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' یہ اس کتاب کے نزول کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے اتارا ہے کہ جن لوگوں نے شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو اس کے انجام سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ جو اپنی اصلاح کرنی چاہیں وہ آخری نتائج کے سامنے آنے سے پہلے پہلے اپنی اصلاح کر لیں۔

قرآن کا اصل مقصد

'وَبُشۡرٰی لِلۡمُحۡسِنِیۡنَ' یہ اس کتاب کا دوسرا مقصد بیان ہوا ہے اور چونکہ اصل مقصود یہی ہے اس وجہ سے اس کا ذکر بشکل اسم ہے۔ فرمایا کہ یہ عظیم اور دائمی خوش خبری ہے خوب کاروں کے لیے۔ 'مُحۡسِنِیۡنَ' یہاں 'الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' کے مقابل میں ہے جس سے لفظ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کی حفاظت کی اور اپنی زندگی کو اپنے خالق کے حدود و قیود کے اندر رکھا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۚ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۱۳-۱۴)

'محسنین' کے کردار کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ

یہ اس بشارت کی وضاحت بھی ہے جس کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا اور 'مُحۡسِنِیۡنَ' کے کردار کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ بھی۔ فرمایا کہ ہمارے جن بندوں نے قرآن کی دعوت حق قبول کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہمارا رب بس اللہ ہی ہے اور اپنے اس اقرار پر وہ تمام مخالفتوں سے بالکل بے خوف ہو کر ڈٹ گئے ہیں ان کے لیے ابدی جنت کی بشارت ہے۔ نہ ان کو مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی غم۔ وہی جنت کے مالک ہوں گے ہمیشہ کے لیے اور یہ چیز ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں ملے گی۔

۲۔ آگے آیات ۱۵ــــ۲۰ کا مضمون

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اس بات کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگوں کو یہ کتاب اپیل کرے گی اور کس طرح کے لوگ ہیں جو اس سے ہمیشہ بیزار ہی رہیں گے۔ اوپر 'الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' اور 'مُحۡسِنِیۡنَ' کے الفاظ سے جن دو قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ گویا انہی کی تفصیل ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو لوگ سلیم الفطرت ہیں، جو ہوش گوش رکھنے والے ہیں، جو اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے اور اپنے ماں باپ کے حقوق پہچاننے والے ہیں وہ اپنے رب کے حقوق ادا کرنے والے بھی بنیں گے۔ قرآن کی دعوت ان کو اپیل کرے گی۔ رہے وہ لوگ جو بالکل مادر پدر آزاد زندگی گزارنے والے، اپنی ذمہ داریوں اور حقوق و فرائض سے بالکل بے پروا ہیں ان

سے کسی خیر کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اپنی ہی راہ چلیں گے اور اسی انجام سے دو چار ہوں گے جو اس طرح کے لاابالیوں کے لیے مقدر ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۲۰

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۵﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَا أَتَعِدَانِنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِن قَبْلِي وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۷﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴿۱۸﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۖ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۹﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ

الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع ۲

ترجمۂ آیات ۱۵ - ۲۰

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا اور دکھ کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کو دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ پہنچ جاتا ہے اپنی پختگی کو اور پہنچ جاتا ہے چالیس سال کی عمر کو وہ دعا کرتا ہے، اے رب! مجھے سنبھال کہ میں تیرے اس فضل کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور وہ نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں۔ اور میری اولاد میں بھی میرے نیک بخت وارث اٹھا۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے بنتا ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے جنت والوں کے ساتھ۔ یہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۵-۱۶

رہا وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم پر تُف ہے! کیا تم لوگ مجھے اس سے ڈراتے ہو کہ دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں! اور وہ اللہ سے فریاد کر رہے ہوتے ہیں کہ تیرا ناس ہو! ایمان لا، اللہ کا وعدہ شدنی ہے! پس وہ جواب دیتا ہے کہ یہ سب محض اگلوں کے فسانے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی وعید پوری ہوئی ان گروہوں کے ساتھ جو ان سے پہلے گزرے جنوں اور انسانوں میں سے۔ بے شک یہ نامراد ہونے والوں میں سے ہوئے! ۱۷-۱۸

اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ہوں گے (تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو) اور تاکہ وہ ان کے اعمال ان کو پورے کر دے اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور اس دن کو یاد رکھو جس دن کفر کرنے والے جہنم کے سامنے لائے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنے حصہ کی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے اور برت چکے تو آج تم ذلت کا عذاب بدلے میں پاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم زمین میں بغیر کسی حق کے گھمنڈ کرتے رہے اور بوجہ اس کے کہ تم نافرمانی کرتے رہے۔ ١٩-٢٠

٣- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (١٥)

ایک سلیم الفطرت کے اندر حقوق کے شعور کا ارتقاء

یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وضاحت ہو رہی ہے اس بات کی کہ ایک سلیم الفطرت اور صحیح المزاج انسان کے اندر حقوق و فرائض کے شعور کا فطری ارتقا کس طرح ہوتا ہے یا کس نہج پر اس کو ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر بھی ودیعت فرمائی ہے اور اسی کی تعلیم اس کے تمام نبیوں اور نیک بندوں نے بھی دی ہے۔ یہ حقیقت تمام مذاہب و ادیان میں ابتداء سے مسلّم رہی ہے کہ خدا کے بعد انسان پر سب سے بڑا حق اس کے ماں باپ ہی کا ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ جہاں تک شعور میں آنے کا تعلق ہے ماں باپ کا حق سب سے پہلے شعور میں آتا ہے۔ پھر اسی حق کے شعور سے انسان خدا اور اس کے حقوق کے شعور تک ترقی کرتا ہے۔ جب تک انسان بچہ رہتا ہے اس وقت تک وہ سب کچھ ماں باپ ہی کو سمجھتا ہے اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی پاتا ہے انہی سے پاتا ہے لیکن جب وہ سن رشد کو پہنچتا ہے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی

ہے کہ اصلی منعم و پروردگار وہ ہے جس نے ماں باپ کو بھی وجود بخشا۔ اس طرح وہ ماں باپ کی انگلی پکڑ کر خدا تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے اندر ماں باپ کے حق سے بھی بڑے حق کا شعور بیدار ہوتا ہے اور یہی دو حق انسان پر سب سے بڑے ہیں اور پھر انہی دو سے بہت سے حقوق کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔

ماں باپ کا حق اولاد پر یہ ہے کہ جب اولاد ہاتھ پاؤں والی ہو جائے اور ماں باپ بڑھاپے کو پہنچیں تو وہ ان کو اپنے اوپر ایک بوجھ نہ محسوس کرے بلکہ یاد رکھے کہ ایک دن وہ ان کی گود میں ایک مضغۂ گوشت کی شکل میں ڈالا گیا تھا لیکن انھوں نے بوجھ سمجھنے کے بجائے اس کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھا اور پال پوس کر اس کو جوان کیا۔ ان کے اس احسان کا حق یہ ہے کہ وہ اپنی اطاعت اور مہر و محبت کے بازو ان کے لیے ہمیشہ جھکائے رکھے۔ نہ ان کی کسی خدمت کو اپنے اوپر بار سمجھے نہ زبان سے کبھی ان کے لیے بیزاری کا کوئی کلمہ نکالے۔

ماں کی جان بازیاں اپنی اولاد کے لیے

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ یہ ان چند جان بازیوں اور قربانیوں کی طرف اشارہ ہے جو ہر ماں کو اپنی اولاد کے لیے لازماً کرنی پڑتی ہیں۔ اس اشارے سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ کوئی اولاد خواہ کچھ ہی کر ڈالے لیکن وہ اپنے ماں باپ کے احسان کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ فرمایا کہ اس کی ماں مہینوں نہایت دکھ کے ساتھ اس کو اپنے پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے، پھر وہ جان کی بازی کھیل کر اس کو جنتی ہے۔ اس کے بعد اس کی رضاعت کا دور آتا ہے اور پورے دو سال وہ اپنے خون کو دودھ بنا کر اس کو پلاتی اور پرورش کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کون ہے جو اس کے لیے اتنے دکھ خوشی خوشی جھیل سکے؟ پھر یہ کتنی بڑی ناسپاسی ہوگی اولاد کی اگر وہ اس احسان کو بھول جائے اور جب ماں باپ اس کے احسان کے محتاج ہوں تو ان سے بے پروائی برتے!

یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ حسنِ سلوک کا مطالبہ تو ماں باپ دونوں ہی کے لیے کیا گیا ہے لیکن تین قربانیاں جو مذکور ہوئی ہیں وہ صرف ماں ہی کی ہیں، باپ کی کسی قربانی کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس کے وجوہ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- پہلی وجہ تو یہ ہے کہ فی الواقع اولاد کی ابتدائی پرورش و پرداخت میں جو حصہ ماں کا ہوتا ہے وہ باپ کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدمت کے معاملے میں ماں کا حق باپ کے بالمقابل تین گنا رکھا ہے۔ یہ حدیث اسی آیت پر مبنی ہے۔

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ ماں کا تعلق جنسِ ضعیف سے ہے۔ اس کا یہ پہلو بھی متقاضی ہے کہ اولاد اس کی خدمت و اطاعت باپ سے بھی زیادہ کرے۔

۳- تیسری وجہ یہ ہے کہ باپ سے بالعموم اولاد کا مادی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ان کو اس سے جائداد و املاک وراثت میں ملنے والی ہوتی ہیں اس سبب سے اس کے معاملے میں کوتاہی یا نافرمانی کا اندیشہ کم ہے برعکس اس کے ماں سے عام حالات میں اس طرح کی توقع کم ہی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ لوگ ماں کی حقیقی قدر نہیں کرتے جن کے اندر اس کی قربانیوں کا صحیح شعور نہیں ہوتا۔

ایک لطیف استنباط

'وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا' سے بعض فقہائے صحابہؓ نے یہ استنباط بھی کیا ہے کہ وضع حمل کی اقل مدت چھ مہینے ہے۔ اس لیے کہ یہاں حمل اور رضاعت دونوں کی مدت تیس مہینے بتائی گئی ہے اور قرآن کے دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ مدتِ رضاعت پورے دو سال ہے۔ اگر ان تیس مہینوں میں سے دو سال نکال دیے جائیں تو حمل کے چھ مہینے بچتے ہیں جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اقل مدتِ حمل چھ ماہ ہے۔ یہ استنباط لطیف ہے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ جیسے اکابر صحابہ اس سے متفق ہیں۔

ماں باپ کے حقوق کا شعور خدا کے حقوق کے شعور کے لیے نشانِ راہ ہے

'حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ..... الآیۃ' یعنی جو شخص اپنے ماں باپ کے حقوق پہچانتا ہے وہ جب جوانی اور عمر کی پختگی کو پہنچتا ہے تو اس کی طبیعت کی یہ سلامت روی لازماً اس کے اندر ربِ حقیقی کے حق کا شعور بھی بیدار کر دیتی ہے۔ وہ ماں باپ کی شفقت و محبت اور ان کی پرورش و پرداخت کے اندر اپنے اصل خالق کی مہر و محبت اور اس کی ربوبیت کی ایک جھلک دیکھ لیتا ہے اور یہیں سے اسے اس پروردگارِ حقیقی تک پہنچنے کی راہ مل جاتی ہے جس نے اس کی پرورش کے لیے ماں باپ کا سایۂ عاطفت مہیا فرمایا۔ گویا ایک حق کا احساس اس کو دوسرے اس سے بڑے حق کے ادا کرنے کے لیے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ اگر کسی کے اندر ماں باپ کے حقوق کا احساس بیدار نہ ہو تو اس کی رسائی خدا کے حقوق تک نہیں ہو سکتی۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے نشانِ راہ دراصل ماں باپ کے حقوق ہی ہیں۔ جس نے اس دروازے کو نہیں کھولا اس کے لیے آگے کی راہ مسدود ہی رہے گی۔

فرمایا کہ اس طرح کا سلیم الفطرت انسان جب اپنی پختگی، خاص کر چالیس سال کی عمر کو، پہنچتا ہے تو وہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ اے رب، تو مجھے سنبھال کہ میں تیری ان عنایات کے شکر کی توفیق پاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمائیں اور ایسے نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں اور میری اولاد میں بھی میرے صالح وارث اٹھا، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے بننے کا عہد کرتا ہوں۔

اس شعور کے بیدار ہونے کا اصلی وقت تو جوانی یا سنِ رشد ہے جس کو یہاں 'بَلَغَ اَشُدَّهٗ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے لیکن رشد کے پیدا ہونے میں اصلی عامل کی حیثیت صرف عمر ہی کو حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں ماحول، تربیت اور دوسرے عوامل کو بھی بڑا دخل ہے اس وجہ سے ہر شخص کے

لیے کوئی ایک عمرِ رشد کی معین نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ ہمارے علماء کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے اور اس اختلاف کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ہماری طبیعت کی کمزوریوں کا لحاظ کر کے اس میں وسعت رکھی ہے اور چالیس سال کی عمر (وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً) کا ذکر یہاں اس کی آخری حد کی حیثیت سے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جوانی کو پہنچ جانے کے بعد یہ شعور ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر بیدار ہو جانا چاہیے۔ کسی کے اندر اگر بعض موانع کے سبب سے بیدار نہ ہو یا پوری طرح بیدار نہ ہو تو چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر تو اس کو لازماً بیدار ہو جانا چاہیے۔ اس عمر کو پہنچ کر بھی اگر کسی کے اندر یہ بیدار نہ ہو تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس شخص نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہے۔

اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ربِ رحیم و کریم نے ہماری طبیعت کی کمزوریوں کا لحاظ کر کے چالیس سال کی عمر تک فی الجملہ رعایت رکھی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ اس عمر تک جذبات و خواہشات کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے۔ آدمی اگر اپنی اصلاح کی کوشش کرتا بھی ہے تو بسا اوقات خواہشوں اور جذبات سے مغلوب ہو کر راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے۔ چالیس سال کے بعد جذبات و خواہشات کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر آدمی ان کو غلط طریقہ پر مہمیز کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ اپنے رہوارِ نفس کو قابو میں کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد اسے کسی مزید الاؤنس کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہاں جو بات فرمائی گئی ہے عام انسانی فطرت اور عام انسانی ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے، ایک خالص اسلامی معاشرہ اور اسلامی ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں فرمائی گئی ہے۔ ایک بگڑے ہوئے معاشرے کے اندر مزاحمتیں زیادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ خاص رعایت فرماتا ہے جو اس طرح کے معاشرے کے اندر اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ میں یہ مزاحمتیں نہیں ہوتیں اس وجہ سے اس میں لوگوں کی مسئولیت بھی زیادہ ہے۔

توفیقِ رشد کی دعا

'اَوْزِعْنِیْٓ' کی وضاحت سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کے معنی ہیں مجھے روک، مجھے تھام، مجھے سنبھال۔ یعنی اب تک تو میں اپنے جذبات کی رَو میں بہتا رہا ہوں لیکن اب تو مجھے توفیق دے کہ میں جذبات و خواہشات کی رَو میں بہنے کے بجائے تیری ان بے پایاں عنایات کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی شکر کا جذبہ تمام دین و شریعت کی بنیاد ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

'وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ'۔ شکر کا جذبہ لازماً عملِ صالح کا محرک بنتا ہے اور عملِ صالح وہ ہے جو نفس کی خواہشوں کی پیروی کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ اس راہ میں بعض اوقات آدمی کو یہ مغالطہ پیش آتا ہے کہ وہ ایک کام اپنے گمان کے مطابق، خدا کی رضا جوئی کے لیے کرتا ہے لیکن وہ خدا کی خوشنودی کے بجائے اس کے غضب کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کام جو فی الظاہر تو نیکی کے ہوتے ہیں لیکن

ان کے اندر بدعت یا شرک کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے انسان کو یہ دعا بھی برابر کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کے ان کاموں کی توفیق بخشے جو اس کی پسند کے مطابق ہوں۔

'وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ' یعنی ساتھ ہی وہ اپنی اولاد کے لیے بھی دعا کرتا ہے کہ ان کے اندر بھی اس کے صالح وارث اٹھیں تاکہ دنیا میں بھی اس کے لیے سرخروئی کا باعث ہوں اور آخرت میں بھی ان کی نیکی اس کے لیے شفاعت بن سکے۔ یہی مضمون رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ .... الآیۃ والی آیت میں گزر چکا ہے اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ' یہ آئندہ کے لیے اس کا اقرار صالح ہوتا ہے کہ اب میں نے تیری طرف رجوع کیا اور تیرے فرمانبردار بندوں میں سے بننے کا عہد کرتا ہوں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ (۱۶)

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔

'فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ' حال کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان کے ساتھ وہ معاملہ ہوگا جو جنت کے مستحقین کے ساتھ ہوگا۔ یہ انھی کے زمرے میں شمار ہوں گے۔

'وَعْدَ الصِّدْقِ' مصدر مؤکّد ہے یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ سچا اور پکا وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

یہ آیت جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جوانوں، خاص طور پر چالیس سال کی عمر کو پہنچے ہوئے لوگوں کو تشویق و ترغیب بلکہ ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ اب ان کے لیے بیدار ہونے کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اگر اب بھی انھوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی رعایت سے اپنے کو محروم کر لیں گے۔

چالیس سال کی عمر کو پہنچنے والوں کو تنبیہ

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۷)

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بالکل مادر پدر آزاد لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ ذکر کر چکے ہیں کہ 'اَلَّذِیْ' جب تمثیل کے لیے آتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس سے لازماً کسی خاص شخص ہی کو مراد لیا جائے بلکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہوگا جس پر تمثیل منطبق ہو۔ سورۂ نحل آیت ۹۲ میں اس کی نہایت واضح مثال گزر چکی ہے۔ یہاں بھی یہ عام ہی ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں اس کا ذکر جمع کے صیغوں ہی سے ہوا ہے۔ جو لوگ عربیت کے اس اسلوب سے آشنا نہیں ہیں وہ ہر جگہ 'اَلَّذِیْ' سے کسی خاص شخص کو مراد لینے کی کوشش کرتے ہیں وہ آیت کے صحیح مفہوم

تمثیل میں 'الذی' کا معروف کے لیے ہونا ضروری نہیں ہے

سے بہت دور نکل جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی بعض لوگوں نے اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فرزند حضرت عبدالرحمانؓ کو مراد لیا ہے۔ اگرچہ مفسرین نے اس قول کو رد کیا ہے لیکن ان کی یہ تردید کسی محکم اصول پر مبنی نہیں ہے اس وجہ سے یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر 'اَلَّذِیْ' معرفہ کے لیے آتا ہے تو اس سے کون مراد ہے؟ ہم نے جو توجیہ کی ہے اس کے بعد یہ سوال نہیں پیدا ہوتا۔

لاابالیانہ روش

یہ اوپر والے گروہ کے مقابل گروہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ جو نوجوان بالکل مادر پدر آزاد زندگی گزارتے ہیں ان کو اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان کے ماں باپ ان کی بے راہ روی پر ان کو ٹوکتے اور خدا و آخرت کی یاد دہانی کرتے ہیں تو وہ ان کو بھی نہایت بے دردی سے جھڑک دیتے ہیں۔ ماں باپ نہایت شفقت اور دردمندی کے ساتھ سمجھاتے ہیں کہ بیٹے! ایمان کی راہ اختیار کر، خدا کا وعدہ شدنی ہے تو وہ ان کو بے وقوف بناتا ہے کہ کیا تم لوگ مجھے اس بات سے ڈراتے ہو کہ مر کھپ جانے کے بعد پھر زندہ کر کے قبر سے نکالا جاؤں گا؟ یہ ایک بالکل مہمل بات ہے۔ نہ جانے کتنی بے شمار خلقت مجھ سے پہلے گزر چکی ہے، ان میں سے کوئی بھی اب تک زندہ ہو کر واپس نہیں آیا تو میں کس طرح باور کر لوں کہ مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا! یہ سب اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہر دور میں کچھ لوگ اس طرح کی بے سروپا باتیں کرتے رہے ہیں کہ قیامت آرہی ہے لیکن قیامت کو نہ آنا تھا، نہ آئی اور نہ کبھی آئے گی۔

'وَیۡلَکَ اٰمِنۡ' لفظ 'ویل' اگرچہ لعنت کے الفاظ میں سے ہے لیکن بعض مواقع میں یہ دل سوزی، شفقت اور دردمندی کے اظہار کے لیے بھی آتا ہے۔ کلام عرب میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ یہاں بھی یہ اسی طرح کے محل میں ہے۔ یعنی ماں باپ نہایت دل سوزی کے ساتھ اس کو سمجھاتے ہیں کہ تیرا ناس ہو! ضد نہ کر، بے راہ روی چھوڑ، ایمان کی راہ اختیار کر اور آخرت سے ڈر۔ لیکن وہ ان کی اس شفقت کی قدر کرنے کے بجائے نہایت نفرت کے ساتھ ان کو جھڑک دیتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَقَّ عَلَیۡہِمُ الۡقَوۡلُ فِیۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا خٰسِرِیۡنَ (۱۸)

لاابالیوں کا انجام

یہ ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ یہاں اشارے، ضمیریں اور افعال سب جمع استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ 'اَلَّذِیْ' یہاں 'اَلَّذِیۡنَ' ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اوپر والی آیت میں ذکر کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ ایک خاص قماش کے لوگوں کا تھا۔ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات پوری ہو گئی۔ 'اللہ کی بات' سے مراد وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمائی تھی کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔ 'فِیۡۤ اُمَمٍ' بالکل اسی موقع و محل میں ہے جس محل میں اوپر والی آیت میں 'فِیۡۤ اَصۡحٰبِ الۡجَنَّۃِ' ہے۔

مقصود اس سے ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ یہ انہی جنوں اور انسانوں کے ساتھی بنیں گے جو ان سے پہلے انہی کی طرح لاابالیانہ زندگی گزار کے اپنی عاقبت برباد کر چکے تھے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۹)

مذکورہ دونوں گروہوں کا انجام

'وَلِكُلٍّ' سے مراد یہاں وہی دونوں گروہ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ فرمایا کہ ان دونوں گروہوں کو ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ملیں گے۔ جنھوں نے اپنے ماں باپ اور اپنے رب کے حقوق پہچانے اور ادا کیے وہ جنت کے مدارج حاصل کریں گے اور جنھوں نے بالکل شتر بے مہار زندگی گزاری وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے دوزخ کے جس طبقہ کے مستحق ہوں گے، اس میں جائیں گے۔ لفظ 'دَرَجٰتٌ' یہاں علی سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔

'وَلِيُوَفِّيَهُمْ' کا معطوف علیہ یہاں محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ ترجمہ میں اس حذف کو میں نے کھول دیا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۲۰)

اوپر 'وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا' میں اگرچہ اجمالاً دونوں گروہوں کے نتائج اعمال کا ذکر ہو چکا ہے لیکن یہاں مخاطب خاص طور پر متکبرین قریش ہیں اس وجہ سے ان کے انجام کی وضاحت خاص طور پر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ اس دن کا خیال کرو جس دن یہ متکبرین جہنم کے سامنے حاضر کیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تمھارے حصہ میں جو نعمتیں مقدر تھیں وہ تم دنیا میں برت چکے۔ اب تمھارے لیے صرف ذلت کا عذاب ہے اس لیے کہ تم بلا کسی حق کے خدا کی زمین میں تکبر اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتے رہے۔

'اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ' کے معنی ہیں تم نے اپنے حصہ کی نعمتیں ختم کر لیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جن لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے اگر وہ اپنے رب کے شکر گزار رہتے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو وہ اپنی آخرت کے لیے بھی نعمتوں کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ نعمتیں پا کر اشکبار میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کا سارا ذخیرہ یہیں ختم ہو جاتا ہے، آخرت میں صرف ان کا وبال ان کے حصہ میں آئے گا۔

'اِسْتِكْبَار' کے ساتھ 'بِغَيْرِ الْحَقِّ' کا اضافہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ ساری نعمتیں بخشتا تو اللہ تعالیٰ ہے تو ان کو پا کر کسی کو اکڑنے اور اترانے کا کیا حق ہے۔ آدمی اترائے تو جب کہ وہ کسی چیز کا خالق ہو اور خدا کے دیے بغیر اس نے محض اپنی ذاتی قابلیت سے کوئی چیز حاصل کی ہو۔

جب ہر چیز خدا ہی کی دی ہوئی ہے تو اترانا بالکل جہل و حماقت ہے اور اس سے بھی بڑی حماقت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتیں اسی کی نافرمانی میں استعمال کرے۔

۴۔ آگے آیات ۲۱ — ۲۸ کا مضمون

آگے بالاجمال قومِ عاد کی تکذیب اور ان کے انجام کا حوالہ ہے۔ مقصود اس حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور قریش کے متکبرین کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو وہ بھی اسی طرح کے انجام سے دوچار ہوں گے جس سے وہ دوچار ہوئے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۱-۲۸

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ ۖ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٢١﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ آلِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٢٢﴾ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿٢٣﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۚ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ ۖ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٤﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٥﴾ وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا

ع ۳ ۲۶

مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٨﴾

ترجمۂ آیات ۲۱ - ۲۸

اور عاد کے بھائی کو یاد کرو، جب کہ اس نے اپنی قوم کو احقاف میں آگاہ کیا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو، میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اس کے آگے اور پیچھے آگاہ کرنے والے گزر چکے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ جھوٹ بول کر ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو تو اگر تم سچوں میں سے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ اس کا صحیح علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ میں تو تمھیں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بالکل جہالت میں مبتلا ہو۔ ۲۱ - ۲۳

پس جب انھوں نے اس عذاب کو بادل کی شکل میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو بولے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے! نہیں بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم نے جلدی مچا رکھی تھی۔ یہ باد تند ہے جس میں دردناک عذاب ہے، یہ تہس نہس کر دے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے۔ پس وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کسی چیز کا بھی نشان باقی نہیں رہا۔ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ ۲۴ - ۲۵

اور ہم نے ان کے قدم ان رفاہیتوں کے اندر جمائے تھے جن کے اندر تمھارے قدم نہیں جمائے اور ہم نے ان کو کان، آنکھ اور دل دیے لیکن چونکہ وہ اللہ کی آیات

کے منکر رہے اس وجہ سے نہ ان کے کان ان کے کچھ کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل۔ اور ان کو گھیر لیا اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اور ہم نے تمھارے گردوپیش کی بستیاں بھی تباہ کر دیں اور ان کے لیے اپنی آیتیں گوناگوں پہلوؤں سے پیش کیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو کیوں نہ ان کی مدد کی انھوں نے جن کو انھوں نے خدا کے تقرب کے لیے معبود بنا رکھا تھا بلکہ وہ سب ان سے کھوئے گئے اور یہ ان کا جھوٹ اور ان کا افترا تھا۔ ۲۶ - ۲۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۲۱)

'اَخَا عَادٍ' سے مراد حضرت ہود علیہ السلام ہیں جو قوم عاد کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم عاد ہی کے ایک فرد تھے اس وجہ سے ان کو عاد کا بھائی کہا۔ رسول کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمام حجت کے پہلو سے اپنے اندر گوناگوں اہمیتیں رکھتا ہے جن کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

'اَلْاَحْقَاف' لغت میں تو ریگ کے مستطیل تودوں کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ ریگستان ہے جو عمان و یمن اور نجد و حضرموت کے درمیان الاحقاف کے نام سے موسوم ہے اور جو قوم عاد کا اصل مسکن رہا ہے۔ اس نام سے ذکر کر کے قرآن نے یہاں اس عظیم تباہی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس علاقہ پر آئی۔ ظاہر ہے کہ جس دور میں قوم عاد یہاں اپنے عروج پر تھی اس زمانے میں یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب اور ان عظیم تمدنی کارناموں سے معمور رہا ہوگا جن کے سبب سے قوم عاد کو تاریخ میں ایک خاص شہرت و عظمت حاصل ہوئی۔ لیکن اب وہی مقام ہے جہاں ایک لق و دق صحرا ہے جس کو دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں تعمیر و تمدن کا بھی کوئی نقش قائم ہوا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ الاحقاف کے نام سے یہ علاقہ عاد کے زوال کے بعد موسوم ہوا ہے جب یہاں شاندار تعمیرات کی جگہ صرف ریت کے ٹیلے رہ گئے۔

"وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ" - یہ سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ "نُذُر" یہاں "نَذِیر" کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا انذار کوئی انوکھا انذار نہیں تھا، آگے اور پیچھے کے علاقوں میں بھی اسی طرح کے منذر آچکے تھے اور انھوں نے اللہ کے جس عذاب سے لوگوں کو ڈرایا تھا اس کے آثار بھی موجود تھے لیکن جس طرح اگلوں نے کوئی سبق نہیں لیا اسی طرح ان پچھلوں نے بھی اپنے منذر کے انذار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

تمام فساد کی جڑ شرک ہے

"اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ" - یہ حضرت ہود علیہ السلام کا اصل انذار ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی نہ کرو۔ اگر تم اپنی روش سے باز نہ آئے تو مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایک ہولناک دن کا عذاب آدھمکے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل فساد کی جڑ شرک ہے جس سے تمام دوسرے فسادات کی شاخیں پھوٹتی ہیں اس وجہ سے اللہ کے رسولوں نے سب سے پہلے اسی سے آگاہ کیا اور اس کا انجام یہ بتایا کہ اگر لوگوں نے اپنی روش کی اصلاح نہ کی تو خدا کے ہولناک عذاب کی زد میں آجائیں گے۔ شرک خدا کی زمین میں اس کے خلاف بغاوت ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جس قوم پر اپنے رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت کر دیتا ہے اور پھر بھی وہ اپنی اس سرکشی سے باز نہیں آتی تو اس کو مزید مہلت نہیں ملتی۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۲)

قوم کی طرف سے عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

"اِفْک" کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔ اس کے بعد "عَنْ" کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ کسی ایسے فعل پر متضمن ہے جس کے معنی پھیرنے اور برگشتہ کرنے کے ہیں۔ یعنی انھوں نے حضرت ہود کے اس انذار کا جواب یہ دیا کہ اچھا، آپ اس مقصد سے ہمارے پاس رسول بن کر تشریف لائے ہیں کہ جھوٹ موٹ اپنی رسالت اور ایک عذاب کی دھونس جما کر ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کریں! اگر یہ بات ہے تو وہ عذاب ہمارے اوپر لاؤ جس سے ڈرا رہے ہو، اس کے بغیر ہم تمہارا سچا ہونا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۡ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۲۳)

حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں فرمایا کہ تم کو اس عذاب سے آگاہ کر دینے کا حکم مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے آگاہ کر دیا، رہی یہ بات کہ وہ عذاب کب آئے گا اور کس شکل میں آئے گا تو اس کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ نہایت ہی سخت جہالت

میں مبتلا ہو کر جس عظیم خطرے سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس کے سدِ باب کی تدبیر سوچنے کے بجائے تم اس کو دعوت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ میں اس خطرے کو لانے والا نہیں بلکہ اس سے آگاہ کرنے والا ہوں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲۴)

عذابِ الٰہی کا ظہور اور مجرموں کا حشر

ضمیر مفعول کا مرجع وہی عذاب ہے جس کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا۔ 'عارض' کے معنی بادل کے ہیں اور یہ یہاں حال کے محل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے تھے جب وہ ایک ابر کی شکل میں ان وادیوں کی طرف بڑھتا نظر آیا تو خوش ہو کر لے کہ یہ ابر باراں ہے جو ہماری وادی کو جل تھل کر دے گا! بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ۔ یعنی وہ تو اس کو ابر باراں سمجھے لیکن صورتِ حال نے بتایا کہ ابر باراں نہیں بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے تھے۔ رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ یہ اس عذاب کی نوعیت واضح فرمائی ہے کہ وہ ایک بادِ تند تھی جس کے اندر ایک دردناک عذاب چھپا ہوا تھا۔ اس بادِ تند کو دوسرے مقام میں صرصر سے تعبیر فرمایا ہے جو کئی دن تک ان پر مسلط رہی اور اس نے ان کو بالکل پامال کر کے رکھ دیا۔ سورۂ حاقہ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ ۙ سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ ۚ (الحاقۃ: ۶-۷)	اور رہے عاد تو وہ ایک بے قابو بادِ تند سے ہلاک کیے گئے اس کو اللہ نے ان پر مسلط رکھا سات رات اور آٹھ دن ان کی جڑ کاٹ دینے کے لیے۔ تم دیکھتے کہ وہ اس کے اندر اس طرح پچھڑے پڑے ہیں گویا کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ (۲۵)

یہ اس بادِ تند کی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے اس طرح کا ستھراؤ کر دیا کہ ان کے مکانوں کے آثار کے سوا اور کوئی چیز دیکھنے کے لیے باقی نہیں رہ گئی۔

كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ صرف ماضی کی ایک کہانی ہے بلکہ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ اگر قریش نے بھی وہی روش اختیار کی جو عاد نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ کا معاملہ ان کے ساتھ مختلف ہو۔ یہ بھی لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶)

قریش کو تنبیہ

یہ قریش کو براہ راست مخاطب کر کے ان کے سامنے وہ سبق رکھا ہے جو اس سرگزشت سے حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اسباب و وسائل کی جو فراوانی اور تعمیر و تمدن کی جو عظمت و شوکت ان کو حاصل ہوئی وہ تم کو حاصل نہیں ہے لیکن دیکھ لو، جب ہم نے ان کو پکڑنا چاہا تو وہ ہماری پکڑ سے اپنے کو بچا نہ سکے! ہم نے ان کو کان، آنکھ اور دل کی تمام صلاحیتیں عطا فرمائیں لیکن چونکہ وہ ہماری آیات کی روشنی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اس وجہ سے ان کے کان، آنکھ، دل ان کے کچھ کام آنے والے نہ بنے بلکہ وہ ساری ذہانت و فطانت رکھتے ہوئے اس عذاب کی گرفت میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔

کان، آنکھ اور دل کی صلاحیتیں آیات الٰہی سے بیدار ہوتی ہیں

اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ کان، آنکھ اور دل کے اندر بھی حقیقی روشنی اللہ تعالیٰ کی آیات ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ آیات الٰہی کے نور سے یہ منور نہ ہوں تو ان کی ساری رسائی صرف محسوسات تک محدود رہتی ہے اور ان محسوسات پر بھی وہ اپنا سارا زور محسوس فوائد ہی کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اس محسوس پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی یہ ساری اصلی صلاحیتیں بالکل کند ہو کے رہ جاتی ہیں۔ وہ اشیاء کے محسوس اور مادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو پر نہ غور کر سکتا اور نہ اس پر غور کرنے کی کوئی ضرورت محسوس کرتا حالانکہ غور کرنے کا اصلی پہلو وہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس طرح کے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کے پاس کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھتے نہیں۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۷)

قریش کو ایک اور تنبیہ

یہ خطاب بھی قریش ہی سے ہے۔ فرمایا کہ عاد کا قصہ اگر کچھ دور کا سمجھتے ہو تو اپنے ماحول کی بستیوں پر نگاہ ڈالو۔ ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں کے پردے ہٹانے کے لیے بھی ہم نے اپنی آیات ان کے سامنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کیں تاکہ وہ اپنے اصل خالق و مالک کی طرف رجوع کریں لیکن انھوں نے بھی ہماری آیات قبول کرنے سے انکار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ یہ اشارہ ان تباہ شدہ بستیوں کی طرف ہے جن پر سے قریش کو اپنے تجارتی سفروں میں گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۸)

ایک سوال

یہ قریش کے سامنے ایک سوال رکھا ہے کہ اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمہارے یہ دیوی دیوتا تمہیں

خدا کی پکڑ سے بچالیں گے تو آخر ان کے معبودوں نے ان کو خدا کے عذاب سے کیوں نہیں بچایا، انھوں نے بھی تو تمھاری ہی طرح ان معبودوں کو خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا تھا؟ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ یعنی وہ تو سب عین وقت پر کھوئے گئے، کوئی بھی ان کے کام آنے والا نہ بنا۔

ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ - یعنی ثابت ہوا کہ یہ سب ان کا جھوٹ اور افترائے محض تھا، انھوں نے محض اپنے جی سے ان کو معبود بنایا اور پھر خدا پر یہ بہتان باندھا کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔

قُرْبَانًا مفعول لہ ہے۔ یہ مشرکین کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ان کے قول مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (ہم ان کو صرف اس خیال سے پوجتے ہیں کہ ہمیں خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب کردیں) میں ہوا ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ مشرکین جن معبودوں کو پوجتے تھے ان کو خلق کا خالق و مالک سمجھ کر نہیں پوجتے تھے بلکہ اس خیال سے پوجتے تھے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں، ان کی عبادت خدا کے تقرب کا ذریعہ ہوگی۔ فرشتوں کے متعلق ان کا جو عقیدہ تھا وہ اس کتاب میں جگہ جگہ زیر بحث آچکا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۲۹ - ۳۵ کا مضمون

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چند آیات میں تسلی دی گئی ہے کہ اگر تمھاری قوم کے لوگ اس کتاب کی ناقدری کر رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو۔ یہ اس کتاب کا یا تمھارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی طبیعت کا فساد ہے ورنہ اس کتاب کی دل کشی اور اثر آفرینی کا حال تو یہ ہے کہ اگر صالحین جن کی کسی جماعت کے کانوں میں اتفاق سے بھی اس کی آواز پڑ گئی ہے تو وہ سراپا گوش ہو کر اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور پھر اس کی دعوت لے کر اپنی قوم کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حیف ہے اگر یہ لوگ، جن کے لیے یہ کتاب اتاری گئی ہے، اس کی قدر نہ کریں۔

اس کے بعد خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں کفار کے لیے تہدید و وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۳۵

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ

بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَی الْحَقِّ وَ
اِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۰﴾ یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا
بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ
اَلِیْمٍ ﴿۳۱﴾ وَ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی
الْاَرْضِ وَ لَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ
مُّبِیْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ؕ
بَلٰۤی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۳﴾ وَ یَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ
قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ
كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ
كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً
مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

ع ۴ | ۹ | ۴

ترجمۂ آیات ۲۹-۳۵

اور یاد کرو جب کہ ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف متوجہ کر دیا قرآن سننے کے لیے۔ تو جب وہ اس کے پاس آئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ خاموش ہو کر سنو! تو جب وہ تمام ہو چکا تو وہ اپنی قوم کی طرف انذار کرتے ہوئے لوٹے۔ انھوں نے کہا کہ اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس کے باب میں پہلے سے موجود

ہیں۔ یہ کتاب حق اور ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور تم کو ایک دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔ ۲۹-۳۱

اور جو اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک نہیں کہے گا وہ یاد رکھے کہ وہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں نکل سکے گا اور اس کے لیے اس کے بالمقابل دوسرے مددگار بھی نہ ہوں گے۔ یہی لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۲-۳۳

اور اس دن کو یاد رکھو جس دن ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ہے دوزخ کے سامنے لایا جائے گا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے! وہ جواب دیں گے، ہاں! ہمارے رب کی قسم، یہ تو حقیقت ہے!! ارشاد ہوگا، تو چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں! ۳۴

پس ثابت قدم رہو جس طرح صاحب عزم رسول ثابت قدم رہے اور ان کے لیے جلدی نہ کرو۔ جس دن یہ لوگ اس چیز کو دیکھیں گے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو یہ محسوس کریں گے کہ گویا دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ پس پہنچا دینا ہے! بالآخر تباہ تو وہی ہوں گے جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ ۳۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ ٱلْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ ٱلْقُرْءَانَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوٓا۟

أَنْصِتُوا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ (۲۹)

جنوں کے قرآن سننے کے واقعہ کی نوعیت

"صَرَفْنَا إِلَيْكَ" کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جنوں کے قرآن سننے کا یہ واقعہ بالکل اتفاقاً، محض اللہ تعالیٰ کی کارسازی سے پیش آگیا۔ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے کوئی اہتمام فرمایا اور نہ جنوں ہی نے اس کا پہلے سے کوئی ارادہ کیا تھا۔ بس اللہ نے پھیر دیا ان کی ایک پارٹی کو متوجہ فرما دیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے ذرا سن لیں۔ چنانچہ انھوں نے سنا اور اسی سننے کا اثر ان پر یہ پڑا کہ وہ اس کے گرویدہ ہوگئے اور ایسے گرویدہ ہوئے کہ اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ طائف والوں کے رویّہ سے نہایت کبیدہ خاطر ہو کر واپس ہوئے ہیں تو راستہ میں نخلہ میں آپ نے رات گزاری ہے۔ وہیں شب کی نمازوں میں سے کسی نماز میں آپ قرآن پڑھ رہے تھے۔ اسی موقع پر جنوں کی اس پارٹی نے قرآن سنا اور اس پر وہ اثر پڑا جو اوپر مذکور ہوا اور جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ مقصود اس واقعہ کے ذکر سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ جن کے لیے اور جن کی زبان میں یہ کلام اترا، جن کی اصلاح کے لیے اللہ کا رسول اپنے دن رات ایک کیے ہوئے ہے، جن کی تلاش میں وہ مکّہ سے سفر کر کے طائف تک پہنچا ہے وہ تو نہ صرف یہ کہ اس کلام کو سننے کے روادار نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول کے ساتھ نہایت بدسلوکی کا رویّہ اختیار کرتے ہیں اور جنات کا حال یہ ہے کہ ان کے اندر جو سلیم الفطرت ہیں اگر وہ سرِ راہے بھی قرآن کی کچھ آیتیں سن لیتے ہیں تو سن کر تڑپ اٹھتے ہیں اور اپنی قوم کے اندر اس کتاب کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خرابی قرآن اور اس کے پیش کرنے والے کے اندر نہیں بلکہ خود ان لوگوں کے اندر ہے جو اس سے گریز کر رہے ہیں۔

اہلِ مکّہ اور طائف کے گنڈوں پر تعریض

"فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا" یعنی قرآن کی بھنک کان میں پڑتے ہی انھوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت کی کہ خاموش اور مؤدب ہو کر اس لائق کلام کو سنو کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ ان کے اس حسنِ ادب کا حوالہ مکّہ اور طائف کے ان گنڈوں کی بدتمیزیوں پر تعریض ہے جن کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے کہ وہ اپنے کارندوں کو یہ سکھاتے کہ جب قرآن سنایا جائے تو اس میں خوب گڑبڑ پیدا کرو کہ اس کی آواز دب جائے اور تم غالب رہو۔ ان کے اسی رویہ کا ذکر سورۂ جن میں یوں الفاظ ہوا ہے: "وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا" (الجن: ۱۹) (اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ، خالص اللہ ہی کی دعوت کے لیے اٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے)۔

[illegible]

"فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ" یہ بات ان کے سچے اور حقیقی تاثر کی شہادت

کے طور پر بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے صرف واہ واہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ کہہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کو بھی اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جس سے اس کتاب نے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ کسی اچھی اور سچی بات پر واہ واہ کر دینے والے تو بُرے سے بُرے زمانے میں بھی نکل آتے ہیں لیکن اس واہ واہ کی اس وقت تک کوئی قیمت نہیں ہے جب تک زندگی کے اندر اس سے کوئی عملی تبدیلی نہ واقع ہو۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت پر سر دھننے والے اور اس کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملانے والے اس زمانے میں بھی بہت ہیں لیکن اس پر عمل کرنے والے اگر آپ ڈھونڈھیں تو وہ عنقا ہیں۔ ان جنوں کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ ان پر اس کتاب کا یہ اثر پڑا کہ وہ اپنی بگڑی ہوئی قوم کے اندر، تمام خطرات سے بے پروا ہو کر، اس کی منادی کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَلَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۰-۳۲)

جنوں کی دعوت اپنی قوم کو

یہ وہ دعوت ہے جو انھوں نے اپنی گمراہ قوم کو دی۔ سب سے پہلے انھوں نے اس کتاب کا تعارف کرایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوئی ہے جو اس کے باب میں سابق صحیفوں میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد صاحب شریعت نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ آپ سے پہلے جتنے بھی انبیاء بنی اسرائیل میں گزرے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کے پیرو تھے۔ اسی طرح قرآن سے پہلے اصل کتاب کی حیثیت صرف تورات کو حاصل رہی ہے، دوسرے آسمانی صحیفے اسی کے ضمیمے ہیں۔ تورات کے بعد مستقل کتاب کی حیثیت قرآن کو حاصل ہوئی اور اس کے آسمانی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ ٹھیک ٹھیک ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوئی جو اس کے باب میں، پہلے سے تورات اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں موجود تھیں۔

'یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ'۔ یہی بات سورۂ جن میں انہی جنوں کی زبان سے معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یوں نقل ہوئی ہے: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا (الجن: ۱-۲) (ہم نے ایک عجیب و غریب قرآن سنا ہے، جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے)
ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ 'حق' سے مراد یہاں عقیدۂ توحید ہے

جو خدا تک پہنچانے والا سیدھا راستہ ہے۔ لفظ 'حق' اس عقیدے کے رسوخ و استحکام اور اس کے مطابق حقیقت و موافق عقل و فطرت ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور 'صراط مستقیم' سے اس کے آسان، ہموار اور کج پیچ سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ دونوں ہی باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے۔

'أَجِيبُوا دَاعِيَ اللهِ وَآمِنُوا بِهِ...... الآیۃ' یہ وہ اصل دعوت ہے جو انھوں نے اپنی قوم کو دی کہ اللہ کے اس داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ۔ 'وَآمِنُوا بِهِ' اسی لبیک کہنے کی وضاحت ہے کہ اصل مطلوب شے ایمان ہے۔ جو ایمان لائیں گے اللہ ان کے گناہوں کو بخشے گا اور ایک دردناک عذاب سے ان کو نجات دے گا۔

حقوق العباد کے معاملات کی نزاکت

'مِنْ ذُنُوبِكُمْ' میں 'مِنْ' تبعیض کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ بعض گناہ ایسے بھی ہیں جن کی معافی کا معاملہ اس ایمان کے بعد بھی محول رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ سنگین قسم کے گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ حقوق العباد کی معافی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی ان کی تلافی کرے۔ اگر ان کی تلافی نہیں کی گئی ہے یا تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ یہ معاملہ فریقین کی موجودگی میں آخرت کی عدالت میں پیش ہو۔ وہاں کیا فیصلہ ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن اتنی بات واضح ہے کہ تلافی کا موقع ہوتے ہوئے اگر تلافی نہیں کی گئی ہے تو یہ چیز ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے اور اگر تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل جا چکا ہے تو امید ہے کہ آدمی کا سچا احساس، سچی توبہ، سچی ندامت اور اس کی وہ نیکیاں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے سفارشی بنیں جو وہ اپنے جرائم کی تلافی کے لیے اپنی بعد کی زندگی میں مرتے دم تک کرے گا۔

قنوطیت کی طرح بے جا رجائیت بھی فتنہ ہے

جن لوگوں نے اس آیت کے اندر 'مِنْ' کو ایک بالکل زائد چیز سمجھ کر اس کی تاویل کی ہے انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ قرآن میں ایک حرف بھی زائد نہیں ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں جس طرح بے جا قنوطیت ناجائز ہے اسی طرح بے جا رجائیت بھی ایک فتنہ ہے۔ نقطۂ اعتدال بیم و رجا دونوں کے بین بین ہے۔

'وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ' یہ بات اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین کے طور پر بھی ہو سکتی ہے لیکن نظائر قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک یہ جنوں ہی کے قول کا ایک حصہ ہے۔ سورۂ جن میں ان کی یہی بات بدیں الفاظ نقل ہوئی ہے۔

وَأَنَّا ظَنَنَّا أَنْ لَنْ نُعْجِزَ اللهَ — اور یہ کہ ہم نے جان لیا ہے کہ نہ ہم زمین میں

فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۝ (الجن : ۱۲) — خدا کے قابو سے باہر نکل سکتے نہ آسمان میں بھاگ کر اس کو ہرا سکتے۔

'وَلَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ' کا تعلق آخرت سے ہے۔ یعنی جس طرح اس دنیا میں وہ خدا کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتے اسی طرح آخرت میں بھی خدا کے مقابل میں ان کا کوئی مددگار و کارساز نہیں بنے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنات بھی قرآن کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح بنی نوع انسان مخاطب ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنات کے بھی اسی طرح رسول ہیں جس طرح ہمارے لیے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو جنوں کے اس قول کا کیا مطلب کہ 'یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ' (اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ) اور اگر اثبات میں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسالت سے متعلق اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہمیشہ سے جاری رہی ہے اور جو قرآن میں وضاحت سے بیان ہوئی ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں بدل دی گئی؟ رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی تو یہ رہی ہے کہ وہ اسی قوم کے اندر سے مبعوث ہوئے جس کی دعوت پر وہ مامور ہوئے۔ اسی زبان میں انھوں نے اپنی دعوت پیش کی جو پوری قوم کی زبان تھی۔ قوم ہی کے اندر انھوں نے اپنی زندگی گزاری اور اس کے ہر طبقہ کے پاس خود جا جا کر، ان کو جھنجھوڑا، جگایا اور ان پر اللہ کی حجت تمام کی۔ اس کے بعد اگر قوم ایمان نہیں لائی تو انھوں نے اس سے اعلانِ براءت کر کے ہجرت کی اور قوم پر اللہ کا عذاب آیا۔ کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے اندر بھی یہ تمام ذمہ داریاں اسی طرح ادا فرمائیں جس طرح انسانوں کے اندر ادا فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ رسول کی ساری زندگی اس کے متبعین کے لیے اسوہ اور نمونہ ہوتی ہے۔ کیا جنات کے لیے کسی بشر کی زندگی کامل اسوہ اور نمونہ ہو سکتی ہے جب کہ یہ بات بالبداہت معلوم ہے کہ ہم انسانوں کے لیے کسی فرشتہ یا جن کی زندگی اسوہ اور نمونہ نہیں ہو سکتی؟ چنانچہ قرآن نے ان لوگوں کے جواب میں، جو مطالبہ کرتے تھے کہ ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو کیوں بھیجا گیا، کسی فرشتہ کو کیوں نہیں بھیجا گیا، کہا بھی ہے کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے کوئی فرشتہ کس طرح بھیجا جاتا۔ اگر فرشتہ بھیجا جاتا تو وہ بھی بہرحال انسانوں ہی کے بھیس میں آتا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ جب جنوں اور انسانوں کی خلقت دو بالکل متضاد عناصر سے ہوئی ہے تو لازماً دونوں کی سرشت، دونوں کے مزاج، دونوں کی معاشرتی، سماجی اور تمدنی ضروریات اور دونوں کے احکام و شرائع میں بڑا فرق ہوگا۔ ان میں مشترک ہو سکتے ہیں تو توحید، معاد اور خیر و شر کے بنیادی کلیات ہی ہو سکتے ہیں، باقی امور تو بہرحال الگ الگ ہوں گے اس وجہ سے قرآن ان کی

رہنمائی کر سکتا ہے تو صرف عقائد اور اخلاقی کلیات کی حد تک ہی کر سکتا ہے۔ زندگی کے دوسرے ابواب میں لازماً وہ محتاج ہیں کہ ان کے اندر انہی کے اندر سے رسول آئیں جو ان کی رہنمائی ان کے فطری تقاضوں ان کی ضروریات اور ان کے حالات و مسائل کے مطابق کریں تاکہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو سکے۔

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے قرآن پر غور کیجیے تو یہی بات اس سے بھی نکلتی ہے۔ اوپر قرآن سے متعلق جنوں کا جو تاثر نقل ہوا ہے اس کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ہوا۔ بعینہٖ یہی تاثرات جنوں کے، زیادہ تفصیل کے ساتھ، سورۂ جن میں نقل ہوئے ہیں۔ وہاں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تاثرات کا علم وحی الٰہی کے ذریعہ سے ہوا۔ چنانچہ اس سورہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے: قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (الجن: ۱) (لوگوں کو بتا دو کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک پارٹی نے قرآن کو سنا تو انھوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ ہم نے ایک عجیب و غریب کلام سنا ہے) اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بھی رسول ہوتے تو ان کے ان سارے تاثرات کا علم آپ کو براہ راست ہونا تھا۔ آپ کو ان کے اندر اسی طرح تبلیغ و دعوت کا فرض ادا کرنا چاہیے تھا جس طرح آپ نے اہل عرب کے اندر یہ فرض ادا کیا، لیکن قرآن سے اس طرح کی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ بعض روایات سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ جنوں کے ایک آدھ وفد آپ کے پاس آئے اور خود آپ بھی بعض وفود کی دعوت پر ان سے ملنے گئے لیکن اول تو ان روایات میں ایسا اضطراب ہے کہ وہ روایت و درایت دونوں کی کسوٹی پر جانچے جانے کی محتاج ہیں، دوسرے ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ جنوں کے وفود آپ سے ملے یا ایک آدھ بار آپ ان کی دعوت پر ان کے پاس گئے۔ صرف اتنی سی بات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ آپ نے بحیثیت ان کے رسول کے ان کے اندر اپنا فرض رسالت ادا فرمایا۔

رہی یہ بات کہ ان جنوں نے قرآن کی تعریف کی اور اپنی قوم کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی تو یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جہاں تک کلیاتِ دین کا تعلق ہے وہ انسانوں اور جنوں کے درمیان بالکل مشترک ہیں بلکہ ہمارے اور فرشتوں کے درمیان بھی مشترک ہیں بلکہ اس سے ایک قدم بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان میں چرند پرند، شجر و حجر اور شمس و قمر سب شریک ہیں۔ اس وجہ سے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے نغماتِ حمد میں پرندے اور پہاڑ ان کی ہمنوائی کرتے تھے، اسی طرح جنوں کے صالحین کی اس پارٹی نے قرآن سنا تو عش عش کر اٹھی اور اس نے اپنی قوم کو بھی توحید اور آخرت پر ایمان لانے اور خدا کے عذاب سے ڈرتے رہنے کی دعوت دی۔ جنوں کی جو دعوت اوپر

مذکور ہوئی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالیے اور سورۂ جن پر بھی، جس میں ان کی دعوت پوری تفصیل سے نقل ہوئی ہے، ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے انہی باتوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے اور انسانوں بلکہ تمام کائنات کے اندر مشترک ہیں۔ اس سے یہ بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی بنیادی دعوت انسانوں اور جنوں دونوں کے لیے یکساں ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کے لیے بھی اسی طرح رسول تھے جس طرح انسانوں کے لیے تھے۔ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے ان کی بات اس سنتِ الٰہی کے خلاف ہے جو قرآن میں رسالت سے متعلق نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔

یہاں ایک اور ضمنی بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے۔

اوپر کی آیات میں جنات کے اہلِ ایمان کے لیے چونکہ صرف عذابِ الیم سے نجات کا ذکر ہوا ہے، ان کو صریح الفاظ میں دخولِ جنت کی بشارت نہیں دی گئی ہے اس وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ صالحینِ جن کے لیے دخولِ جنت کے قائل نہیں تھے یا کم از کم یہ کہ وہ یہ بات صریح الفاظ میں کہنے سے احتیاط کرتے تھے۔ ہماری سمجھ میں امام صاحبؒ کی یہ احتیاط کسی طرح نہیں آئی۔ جب جنات کے بُروں کے لیے دوزخ لازمی ہے تو آخر ان کے صالحین جنت سے کیوں محروم رہیں گے؟ بعض متاخرین نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسلک کی تائید میں یہ دلیل دی ہے کہ خدا کے اوپر کسی کا حق قائم نہیں ہے اس وجہ سے اگر وہ کسی کے صلاح و تقویٰ کے باوجود اس کو جنت میں نہ داخل کرے تو یہ بات خلافِ عدل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دلیل بالکل لایعنی ہے۔ خدا کے اوپر کوئی دوسرا تو کوئی حق قائم نہیں کر سکتا لیکن جو حقوق اس نے از خود اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر اپنے اوپر قائم کر رکھے ہیں اور جن کو پورا کرنے کا نہایت قطعی اور حتمی الفاظ میں اس نے اپنے صالح بندوں سے وعدہ کیا ہے آخر ان سے اس کے نیک بندوں کو، خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا جنات میں سے، وہ کیوں محروم رکھے گا؟ ہمارا خیال ہے کہ امام صاحب نے اگر فرمائی ہوگی تو یہ بات فرمائی ہوگی کہ صالحینِ جن اس جنت میں نہیں جائیں گے جو انسانوں کے لیے ہے۔ اگر انھوں نے یہ بات فرمائی تو اس کا ایک محل ہے۔ اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ جن کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کریں گے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتٰى ۚ بَلٰى إِنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۳)

مکذبین کو انذار

یہ سورہ کے خاتمہ پر مکذبین کو انذار ہے کہ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی وہ مُردوں کو بھی زندہ کر کے اٹھا کھڑا کرنے پر قادر ہے۔ یہی سوال دوسرے مقامات میں بھی قرآن نے منکرینِ قیامت کے سامنے

رکھا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے، اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (ق: ۱۵) (کیا ہم پہلی بار لوگوں کو پیدا کرنے سے عاجز رہے ؟) بعض جگہ یہ سوال کیا ہے کہ بتاؤ، آسمان و زمین کو پیدا کر دینا زیادہ مشکل ہے یا مُردوں کو دوبارہ پیدا کر دینا۔

بَلٰٓی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ سوال کرکے خود ہی جواب دیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے عاجز نہیں رہا وہ نہ صرف مردوں کو زندہ کر دینے پر قادر ہے بلکہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم قرآن مجید کے اس اسلوبِ بیان کی طرف جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ مخاطب کے لیے جس جواب سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی بعض اوقات قرآن وہ خود ہی اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَلَی النَّارِ ط اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ ط قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ط قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ (۳۴)

یہ اسی انذار کی تصویر ہے کہ اس دن کی یاد کو ہمیشہ مستحضر رکھو جس دن کفر کرنے والوں کو دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ان سے سوال ہوگا کہ بتاؤ قیامت ایک واقعہ اور حقیقت ثابت ہوئی ہے یا نہیں ؟ اس وقت وہ اپنے رب کی قسم کھا کر جواب دیں گے، ہاں ! ہمارے رب کی قسم، بلاشبہ یہ ایک امرِ واقعی ثابت ہوئی ! ان کے اس اعتراف کے بعد حکم ہوگا کہ اب جاؤ، اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو ! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قیامت کے دلائل آفاق و انفس کے اندر لتنے واضح ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے بھی قیامت کا انکار کیا ہے کسی دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ محض اس لیے کیا کہ وہ اپنی نفس کی خواہشوں کو قربان کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں اپنی عقل، اپنی فطرت پھر تمام نبیوں اور رسولوں کی تکذیب کر ڈالی وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّھُمْ ط کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ لا لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَۃً مِّنْ نَّھَارٍ ط بَلٰغٌ ج فَھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۳۵)

نبی صلعم کو استقامت کی تلقین

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین ہے کہ جس طرح تم سے پہلے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے عزم و جزم کے ساتھ تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے موقف حق پر جمے رہے اسی طرح دشمنوں کی تمام سازشوں اور ایذا رسانیوں کے علی الرغم تم بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ مِنَ الرُّسُلِ میں 'من'، میرے نزدیک تبعیض کے لیے نہیں بلکہ بیان کے لیے ہے۔ امتحان اللہ کے تمام رسولوں کو پیش آئے ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، اور تمام رسولوں نے بلا استثناء

ان امتحانوں میں سو فی صد کامیابی حاصل کی ہے۔

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔ یعنی اگر یہ لوگ تمھیں زچ کرنے کے لیے عذاب کی جلدی مچائے ہوئے ہیں تو ان کی جلد بازی سے پریشان ہو کر تم ان کے لیے عذاب کی جلدی نہ کرو۔ آج ان کو جو مہلت طویل معلوم ہو رہی ہے جب عذاب سامنے آئے گا تو یہ محسوس کریں گے کہ بس دن کی ایک گھڑی دنیا میں رہے ہوں گے۔

بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ 'بَلٰغٌ' مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ساری توجہ خبر پر مرکوز کر دینے کے لیے مبتدا کو حذف کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا کام بس لوگوں تک اپنے انذار کو اچھی طرح پہنچا دینا ہے تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اس کے بعد اگر یہ لوگ تباہ ہوئے تو اس کی ذمہ داری خود ان پر ہوگی۔ اگر یہ نادان لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں تو مچائیں، جب وہ آئے گا تو اس کی برقِ خرمن سوز کن پر گرے گی! انھی نافرمانوں ہی پر تو گرے گی!!

ربِ کریم و کارساز کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد

۴ر اگست ۱۹۷۶ء

۷ر شعبان ۱۳۹۶ھ